فروری ۱۹۹۱ء

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

حرفِ اوّل	عاکف سعید	۲
حکم و عبر (خلیج کی صورتحال اور قرآن حکیم کی رہنمائی)	ڈاکٹر اسرار احمد	۵
درسِ قرآن (سورۂ ابراہیم آیات ۲۸ - ۳۰)	ڈاکٹر اسرار احمد	۱۹
ہدایت القرآن (۴۷)	مولانا محمد تقی امینیؒ	۲۳
قاضی عیاض مالکیؒ (کاروانِ حدیث: ۱۳)	عبدالرشید عراقی	۲۷
حکمتِ اقبال (۳۰)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم	۳۱
ڈاکٹر طاہر سعید کے نام (۱۱)	ڈاکٹر حافظ محمد مقصود	۴۵
لغات و اعراب قرآن (۲۱)	پروفیسر حافظ احمد یار	۴۹

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

احباب مطلع رہیں کہ ان شاء اللہ العزیز

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

کے سالانہ

محاضراتِ قرآنی

جمعہ ۸ تا منگل ۱۲ مارچ ۱۹۹۱ء روزانہ بعد نماز مغرب

قرآن آڈیٹوریم

اتاترک بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور

میں منعقد ہوں گے۔

جن میں اس سال **ڈاکٹر اسرار احمد** پانچ خطبات

حقیقتِ ایمان

کے موضوع پر ارشاد فرمائیں گے اور اہلِ علم وفضل کے پینل کے سوالات کے جوابات بھی دیں گے ——— خطبات کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

- خطبۂ اوّل ——— ● ایمان کا لفظی اور اصطلاحی مفہوم ● ایمان کا موضوع اور ایمانیاتِ ثلٰثہ
- خطبۂ دوم ——— ● ایمان کے دو درجے یا دو پہلو ● ایمان کا گھٹنا اور بڑھنا
- خطبۂ سوم ——— ● ایمان اور عمل ● ایمان اور جہاد
- خطبۂ چہارم ——— ● ایمان کے ثمراتِ باطنی ● ایمان اور امن
- خطبۂ پنجم ——— ● ایمان کے اجزائے ترکیبی ● حصولِ ایمان کے ذرائع

ع "صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے!"

——— (نوٹ: خواتین کے لیے پردہ کا اہتمام ہوگا) ———

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ۔ مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ادارۂ تحریر

پروفیسر حافظ احمد یار، حافظ خالد محمود خضر

جلد ۱۰ | فروری ۱۹۹۱ء رجب المرجب ۱۴۱۱ھ | شمارہ ۲

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور فون: ۸۵۶۰۰۳

کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل متصل شاہ یحییٰ۔ شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرتعاون ۴۰/- روپے فی شمارہ ۴/- روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حرفِ اوّل

اس سال مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام سالانہ محاضرات قرآنی ان شاء اللہ العزیز ۸ تا ۱۲ مارچ قرآن آڈیٹوریم لاہور میں منعقد ہوں گے۔ محاضرات کا ایک جامع عنوان "حقیقت ایمان" طے پایا ہے۔ اس موضوع پر پانچوں روز مرکزی خطابات انجمن کے صدر موسس محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ہوں گے۔

محترم ڈاکٹر صاحب نے اس موضوع کو جو ان کے پسندیدہ موضوعات میں سے ہے' دس ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔ پروگرام یہ ہے کہ وہ اپنے خطاب میں روزانہ دو عنوانات کو Cover کریں گے اور اس طرح پانچ نشستوں میں ان شاء اللہ العزیز یہ اہم بحث مکمل ہوگی۔ ہر نشست میں سوالات کے لئے اہل علم و دانش پر مشتمل ایک پینل تشکیل دیا جائے گا۔ نشست کے اختتام پر محترم ڈاکٹر صاحب پینل کے سوالات کے جوابات دیں گے۔ اس طرح امید ہے کہ ایمان سے متعلق تمام اہم موضوعات نکھر کر سامنے آئیں گے۔ قبل ازیں ۲۲ تا ۲۵ فروری تنظیم اسلامی کا سولھواں سالانہ اجتماع بھی لاہور ہی میں منعقد ہوگا۔ ان دونوں اہم اجتماعات کے تفصیلی اعلانات زیر نظر شمارے کے ٹائیٹل کے اندرونی صفحات پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

خلیج کی سنگین صورت حال ہر ذی شعور مسلمان کے لئے انتہائی پریشان کن اور تشویشناک ہے۔ ماہ جنوری کے دوران محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اپنے متعدد خطبات جمعہ میں اس نازک مسئلے پر اظہار خیال فرما چکے ہیں۔ ان کے تجزیوں پر مشتمل خطابات کا ماحصل ۱۴ر فروری کے "ندا" میں شائع ہو چکا ہے جو ان کے نقطہ نظر کی کامل اور بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ جو قارئین خلیج کی جنگ کے بارے میں محترم ڈاکٹر صاحب کے خیالات جاننے کے خواہشمند ہوں ان کے لئے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ وہ "ندا" کے مذکورہ بالا شمارے کا مطالعہ ضرور فرمالیں ——— تاہم اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے محترم ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک خطاب جمعہ میں سورۃ الروم اور سورۃ السجدہ کی بعض آیات کا تقابلی جائزہ درس قرآن کی شکل میں پیش کیا تھا۔ موجودہ حالات کے تناظر میں ان آیات کا مطالعہ فکر کی نئی راہوں کو کھولنے کا باعث بنتا محسوس ہوتا ہے۔ اس درس کی افادیت کے

پیش نظر اسے "حکم و عبر" کے زیر عنوان اسی شمارے میں شائع کیا جا رہا ہے۔

"حکمت قرآن" کے جو قارئین ماہنامہ "میثاق" کا بھی باقاعدگی سے مطالعہ کرتے ہیں ان تک مولانا محمد تقی امینی کے انتقال کی افسوسناک خبر پہنچ چکی ہوگی۔ سچی بات یہ ہے کہ مولانا کا انتقال ہمارے لئے ایک سانحے سے کم نہیں۔ ان سے جو ایک تعلق خاطر "حکمت قرآن" کے حوالے سے قائم ہوا تھا اس نے ان کے انتقال کے صدمے کو کئی چند کر دیا ہے۔ "ہدایت القرآن" کے نام سے مولانا مرحوم کا بلند پایہ تفسیری سلسلہ "حکمت قرآن" کے لئے ایسا جزو لازم بن چکا تھا جس کے بغیر یہ پرچہ بلاشبہ ادھورا محسوس ہوگا۔ "حکمت قرآن" کی پہلی جلد سے یہ تفسیری سلسلہ پرچے کا مستقل جزو رہا ہے۔ مولانا نہایت اہتمام اور بڑے اشتیاق سے اس کی اقساط ہمیں ارسال فرمایا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا کے انتقال سے ہم ان کے قلمی تعاون ہی سے محروم نہیں ہوئے' ان کی نیک دعاؤں اور بھرپور اخلاقی معاونت سے بھی محروم ہوگئے جو ان کی حیات دنیوی کے آخری سانس تک ہمیں حاصل تھی۔ ہم تہہ دل سے دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی علمی و فکری کاوشوں کو شرف قبول سے نوازے اور انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

مولانا محمد تقی امینی کے انتقال کی خبر ہمیں علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ علوم اسلامیہ کے سابق ڈائریکٹر جناب اقبال انصاری صاحب کے خط کے ذریعے ہوئی۔ مولانا مرحوم کو "حکمت قرآن" اور اس کے مدیر سے جو خصوصی تعلق خاطر تھا اس کا اظہار انصاری صاحب کے خط سے ہوتا ہے جو حسب ذیل ہے:

مکرمی و محترمی' السلام و علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ

امید ہے کہ مزاج گرامی بہ وجوہ بخیر ہوگا۔ میں کئی دن سے آپ کو خط لکھنے کا قصد کر رہا تھا مگر کل مولانا تقی امینی کے ناگہانی حادثہ انتقال پرملال نے مجبور کر دیا کہ آپ کو اس واقعہ فاجعہ کی اطلاع دے کر مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کی درخواست کروں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

عجب اتفاق ہے کہ پرسوں دوپہر یعنی انتقال سے تقریباً چوبیس گھنٹہ قبل مرحوم حکمت القرآن میں سلسلہ تفسیر کے مکمل ہو جانے کے دعا خواہ ہوئے تھے اور اسی

ہمارے زیر درس ہیں اور ان میں جو مضمون بیان ہوا ہے وہ موجود الوقت صورت حال کے اعتبار سے بہت اہم ہے -- ---- دوسری طرف سورۃ السجدہ کی آیات کی تعداد تیس ہے۔ اور وہی مضمون اس سورۃ کی ۲۱ ویں تا ۲۵ ویں آیات میں ملتا ہے۔ حجم کے اعتبار سے دیکھئے کہ جو مناسبت ساٹھ اور تیس کی آپس میں ہو سکتی ہے وہی نسبت چالیس اور بیس میں بنتی ہے۔ یعنی سورۃ الروم میں بھی متعلقہ آیات سورۃ کے ۲/۳ کے بعد وارد ہوئی ہیں اور سورۃ السجدہ میں بھی اس مضمون کی حامل آیات کا ورود سورۃ کے دو تہائی کے بعد ہوا ہے۔ ان دونوں مقامات میں یہ قدر مشترک ہے کہ مضمون کے اعتبار سے ان کی پہلی پہلی آیات میں بہت گہرا تعلق اور ربط ہے اور دیگر آیات بھی مفسرین کے اصول کے مطابق کہ **"اَلْقُرْاٰنُ یُفَسِّرُ بَعْضُہٗ بَعْضًا"** ایک دوسرے کی تشریح و تفسیر کرتی ہیں۔

اب آیئے ان آیات کا مطالعہ کریں۔ فرمایا: **ظَہَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ** "ظاہر ہو چکا ہے فساد' بحر و بر میں"۔ دیکھئے اس وقت کے حالات پر یہ آیت پوری پوری منطبق ہو رہی ہے۔ ڈیڈ لائن کے ختم ہونے میں اب چند روز رہ گئے ہیں۔ (واضح رہے کہ یہ تقریر ۴ جنوری کے اجتماع جمعہ میں کی گئی تھی جبکہ امریکہ کی طرف سے عراق کو دی گئی ڈیڈ لائن ختم ہونے میں گیارہ روز باقی تھے) ایک بہت بڑا دھماکہ ہونے والا ہے' جس کی ٹِک ٹِک کی آوازیں گویا سنائی دے رہی ہیں اور دنیا اس وقت تباہی کے کنارے پر کھڑی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کو اندازہ نہیں ہے کہ کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے۔ وہ بڑے اطمینان میں ہیں کہ نہ جاننا بھی مصائب سے وقتی طور پر محفوظ اور اطمینان میں رہنے کا باعث بنتا ہے۔ لیکن اگر حالات کا شعور ہو تو رات کی نیند حرام ہو سکتی ہے۔ میرے خیال میں اس بات کا امکان ۹۰ فیصد ہے کہ جنگ ہو کر رہے گی۔ دس روز قبل میں جب لاس اینجلس میں تھا تو وہاں مجھے ٹی وی پر امریکہ کے ایک سیاست دان کا جو بڑے اونچے منصب پر فائز تھے' انٹرویو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ وہ صاحب امریکہ کے ان سیاست دانوں میں شامل سمجھے جاتے ہیں جو جنگ کے شدید مخالف ہیں۔ ان سے جب یہ آخری سوال کیا گیا کہ آپ کے خیال میں جنگ کے امکانات کتنے ہیں؟ ان کا جواب یہ تھا کہ ۵۵ فیصد امکان اس بات کا ہے کہ جنگ نہیں ہوگی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بعد کے دس دنوں میں

بنیادی تبدیلی آ چکی ہے اور اس وقت میری رائے میں جنگ ہونے کے ۹۰ فیصد قوی امکانات ہیں۔

آج کے 'نوائے وقت' میں "TIMES" کے حوالے سے ایک طویل مضمون شائع ہوا ہے جس کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنگ لازماً ہوگی۔ اس لئے کہ یہ امکان کہ صدام گھٹنے ٹیک دے' شکست تسلیم کر لے اور اپنی موت کے وارنٹ پر دستخط کر دے' قرین قیاس نہیں ہے۔ یہ صدام کے مزاج کے بالکل برعکس ہے اور اس کی توقع نہ ہونے کے برابر ہے۔ دوسرا امکان یہی رہ جاتا ہے کہ عراق پر امریکہ حملہ کرے اور زوردار حملہ کرے۔ ٹائمز کے طویل مضمون کا مرکزی خیال یہی ہے۔ مضمون نگار نے بش کو بہت ابھارا ہے کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھائے اور عراق کی طاقت کو کچل کر رکھ دے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکہ کے تمام وسائل و ذرائع پر یہودیوں کا مکمل تسلط ہے اور سب سے بڑھ کر یہی قوم اس وقت جنگ کے حق میں ہے۔ قسمت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ یہود کے ساتھ ساتھ سعودی عرب کے موجودہ اور کویت کے معزول حکمران بھی اس وقت جنگ کی سب سے شدید تمنا رکھتے ہیں۔ ان تینوں کی یہ پوری کوشش ہے کہ جنگ ہونی چاہئے تاکہ صدام کی جنگی صلاحیت کو پوری طرح کچل کر رکھ دیا جائے۔ امریکہ کی رائے عامہ (public opinion) جنگ کے خلاف ہے لیکن یہودی پریس جنگ کے حق میں رائے عامہ کو موڑنے کی کوشش میں مصروف ہے۔

بہرحال "بحر و بر میں فساد ظاہر ہو چکا ہے"۔ لیکن کس سبب سے ہوا ہے؟ اللہ تو ظالم نہیں...! پھر یہ سب کیوں ہے۔ فرمایا: "بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ"۔ "بہ سبب انسانوں کے ہاتھوں کی کمائی کے" کہ یہ سب کچھ لوگوں کے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ہے۔ یہ انسان کے اپنے کرتوت ہیں' ہر طرف غلط اور باطل نظام رائج ہیں' استحصال کا دور دورہ ہے' لوگوں کے حقوق کا غصب کیا جانا معمول بن چکا ہے' اسی طرح ایک قوم کا دوسری قوم پر غلبہ حاصل کرنے اور اس کے وسائل پر قبضہ کر لینے کی خواہش جو سراسر ظلم اور زیادتی کا مظہر ہے۔ یہ ہیں وہ وجوہات اور یہ ہے ہمارے ہاتھوں کی وہ کمائی جس کے باعث دنیا تباہی کے دہانے تک پہنچ چکی ہے۔ 'فساد فی الارض' کی بے شمار صورتیں ہیں۔ کہیں کوئی ایک قوم طبقاتی کشمکش کا شکار ہو کر باہم دست و گریبان ہو جاتی ہے۔ اسی کی ایک شکل یہ بھی

ہے کہ دنیا اس وقت ترقی یافتہ ممالک اور ترقی پذیر یا پسماندہ ممالک میں بٹی ہوئی ہے۔ اور ترقی یافتہ ممالک غیر ترقیاتی ممالک کو کسی طور پر اٹھ بیٹھنے کی اجازت دینے کے لئے تیار نہیں۔ ان کے سارے ہتھکنڈے اس بات کے لئے ہوتے ہیں کہ یہ ممالک ترقی نہ کرنے پائیں۔ گو ظاہراً یہ ممالک اپنے آپ کو پسماندہ ممالک کا 'ہمدرد' بنا کر پیش کرتے ہیں لیکن ان کی پالیسی کا مرکزی نکتہ یہی ہوتا ہے کہ انہیں جکڑ کر رکھا جائے اور یہ کسی طرح ان کے چنگل سے نکل نہ پائیں۔ قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ گواہ ہے کہ یہ صورت حال ایک وقت تک تو برقرار رہتی ہے' لیکن پھر۔

خونِ اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری

کے مصداق غالب طاقت کے مقابلے میں کوئی اور طاقت اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور ان کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ سورۃ الحج میں فرمایا گیا: **وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيرًا** ــــ کہ اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہتا تو (نصاریٰ کی) خانقاہیں اور گرجے' (یہودیوں کے) عبادت خانے اور (مسلمانوں کی) مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے کبھی کے ڈھائے جا چکے ہوتے۔ اللہ کی سنت یہی رہی ہے کہ جب زمین میں زیادہ فساد ہو جاتا ہے تو وہ ایک قوم کے ذریعے دوسری قوم کو ملیا میٹ کرا دیتا ہے' تاکہ گند دھل جائے۔ جیسے آپ کوڑے کرکٹ کو جمع کر کے آگ لگا دیتے ہیں' اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی مختلف مواقع پر زمین میں صفائی کرتا رہا ہے۔ بہرحال یہ لوگوں کے اپنے کرتوتوں کے سبب ہوتا ہے' جسے فرمایا: **"بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ"**۔

اب اس کے بعد فرمایا جا رہا ہے کہ اس کا مقصد کیا ہے؟ **"لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا"** "تاکہ اللہ انہیں چکھا دے ان کے کچھ کرتوتوں کا مزہ"۔ یعنی یہ سزا لوگوں کے بعض اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے' تمام تر اعمال کا نہیں۔ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ انسانوں کی تمام بداعمالیوں کی سزا اسی دنیا میں دینے لگے تو الفاظ قرآنی **"مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَابَّةٍ"** کے مصداق اس زمین کی پشت پر انسان تو کیا کوئی جاندار بھی باقی نہ بچے۔ لیکن اللہ کا قاعدہ اور سنت یہ رہی ہے کہ ان کے کچھ کرتوتوں کی سزا کے طور پر تھوڑا بہت عذاب دے دیتا ہے۔ اور اس میں حکمت یہ بیان فرمائی کہ: **"لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ"** "شاید کہ وہ

لوٹ آئیں"۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر اپنی روش تبدیل کر لیں۔

یہ سورۃ الروم کی آیت ۴۱ تھی' جس کا ہم نے مطالعہ کیا۔ اب تقابل کے لئے سورۃ السجدہ کی آیت ۲۱ ملاحظہ فرمائیں جس میں یہی مضمون بایں الفاظ بیان فرمایا گیا: "وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ" "اور ہم انہیں لازماً چھوٹے عذاب کا مزہ چکھائیں گے بڑے عذاب سے پہلے' شاید کہ یہ لوٹ آئیں"۔

یہ دراصل لوگوں کو ہوش میں لانے کے لئے تنبیہات ہوتی ہیں۔ اور کسی قوم کے لئے بڑا عذاب یہ ہے کہ اسے نسیاً منسیاً کر دیا جاتا ہے۔ جیسے سورۃ الانعام میں فرمایا: "فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا" "پس ظالم قوم کی جڑ کاٹ دی گئی"۔ یا سورہ ہود میں الفاظ وارد ہوئے: "كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا" "گویا کبھی اس سرزمین میں آباد ہی نہیں ہوئے تھے"۔ اس عذابِ استیصال کی ایک مثال ہماری اپنی تاریخ میں بھی موجود ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ مسلمانوں نے آٹھ سو سال تک ہسپانیہ کے جزیرہ نما پر حکومت کی ہے' جن میں پانچ سو برس تو ایسے ہیں کہ اس پورے علاقے پر حکومت تھی' لیکن آج وہاں "كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا" کا نقشہ سامنے آتا ہے۔ آج وہاں صرف ان کی تعمیرات کے کھنڈر باقی ہیں۔ مسجدِ قرطبہ میں نماز پڑھنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔

سورۃ الروم کی اگلی آیت ہے: "قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلُ كَانَ أَكْثَرُهُم مُّشْرِكِينَ۔ "(اے نبی) ان سے کہئے کہ زمین میں گھومو پھرو اور دیکھو کہ کیا انجام ہوا پہلے لوگوں کا! ان کی اکثریت مشرکوں پر مشتمل تھی"۔

یہاں یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ شرک صرف بت پرستی کا نام نہیں' شرک کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اور دورِ حاضر کا بہت بڑا شرک مادہ پرستی اور زر پرستی ہے۔ اگر دولت کی دیوی کو پوجنے والا مشرک ہے تو براہ راست دولت کا پجاری مشرک کیوں نہ ہوگا؟ جو شخص حلال و حرام کی پابندیوں کو بالائے طاق رکھ کر دولت سمیٹنے میں لگا ہوا ہے تو دراصل اس نے دولت کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ ایسے شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے درہم و دینار کا بندہ قرار دیا ہے۔ آپ نے فرمایا: تَعِسَ عَبْدُ الدِّينَارِ وَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ۔[1] "دینار اور درہم کا بندہ برباد ہوگیا"۔ کسی کا نام اگرچہ عبداللہ یا عبدالرحمٰن ہی کیوں نہ ہو' وہ

---

[1] رواہ البخاری' عن ابی ہریرہ

دولت کا پجاری ہونے کے ناتے عبدالدینار اور عبدالدرہم ہے۔ شریعت کی حدود و قیود سے آزاد ہو کر خواہشات نفس کی پیروی شرک ہے' سورۃ الفرقان میں فرمایا گیا: "اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ"۔ "کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہشات نفس کو اپنا معبود بنا لیا؟" اسی طرح انسانی حاکمیت کا تصور شرک ہے۔ حاکم تو صرف وہ ہے۔ "اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ"۔ تو یہ نہ سمجھئے کہ یہاں صرف بت پرست قوموں کا ذکر ہو رہا ہے۔ بلکہ شرک کے تو لاکھوں بھیس ہیں اور ہر دور میں اس کا ایک نیا بھیس ہوتا ہے جسے پہچاننا بہت ضروری ہے۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ آدمی سابقہ ادوار کے شرک سے تو بچا رہے لیکن اپنے دور کے شرک میں گردن گردن ڈوبا ہوا ہو۔ یہاں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ ہلاک ہونے والی سابقہ قوموں کی اکثریت مشرکوں پر مشتمل تھی۔

اب اس آیت کا سورۃ السجدہ کی اگلی آیت سے تقابل کیجئے: "وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ"۔ "اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جسے اس کے رب کی آیات کے ذریعے تذکیر کرائی گئی' پھر اس نے اس سے اعراض کیا۔ یقیناً (ایسے) مجرموں سے تو ہم انتقام لے کر رہیں گے!" دونوں آیات میں عجیب ربط ہے۔ سورۃ الروم میں حالات اور تاریخ کے مشاہدے سے تذکیر کا بیان ہوا ہے یعنی امم سابقہ کے حالات سے سبق حاصل کیا جائے۔ یہ تذکیر کی ایک صورت ہے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا: اَلسَّعِيْدُ مَنْ وُعِظَ بِغَيْرِهٖ [1] یعنی سعادت مند بندہ وہ ہے جو دوسروں کی حالت سے سبق حاصل کرے۔ سورۃ السجدہ میں تذکیر کی دوسری صورت بیان ہوئی ہے' یعنی تذکیر بالقرآن۔ وہ شخص واقعتاً سب سے بڑھ کر ظالم ہے جس نے امم سابقہ کے حالات و واقعات سے بھی کوئی سبق نہیں سیکھا اور جب اسے اللہ کی آیات سنائی گئیں اور ان کے ذریعے سے اسے تذکیر و نصیحت کی گئی تو پھر بھی وہ ہوش میں نہیں آیا۔ یہ ظلم کی انتہا ہے۔ یہ گمراہی کی آخری منزل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی قوم کی طرف اللہ کے رسول کو مبعوث کر دیا جاتا اور پھر بھی وہ قوم اپنی روش سے باز نہ آتی تو اس سے کوئی رعایت نہیں برتی جاتی تھی۔ پروردگار کی طرف سے حق اگر پوری

---

[1] رواہ مسلم' عن عامر بن واثلہ

طرح مبرہن ہو جائے اور اس میں کوئی ابہام و اشکال باقی نہ رہے اور لوگ پھر بھی کفر پر اڑے رہیں تو وہ گویا اس کے حقدار ہیں کہ نسیًا منسیًا کر دیئے جائیں۔

تذکیر بالقرآن کے حوالے سے ذرا ہمیں اپنا جائزہ بھی لینا چاہئے۔ ہمارے یہاں برعظیم پاک و ہند میں تذکیر بالقرآن کا آغاز تین صدیاں قبل حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمتہ اللہ علیہ سے ہوا۔ اس میدان میں حضرت شاہ صاحب اور ان کے خاندان کی خدمات نہایت قابل قدر ہیں۔ تاہم اس بیسویں صدی عیسوی میں یہاں تذکیر بالقرآن کا ڈنکا بجانے والا پہلا شخص ابوالکلام آزاد ہے۔ انہوں نے واقعۃً ایک مرتبہ برعظیم پاک و ہند میں بسنے والے مسلمانوں کو قرآن حکیم کی طرف متوجہ کر دیا۔ میں جس ابوالکلام کا ذکر کر رہا ہوں وہ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک کے ابوالکلام ہیں۔ بعد میں وہ بد دل ہو گئے اور میرے خیال میں پھر مایوس ہو کر انہوں نے صرف جہادِ حریت کو اپنا میدان بنا لیا۔ اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ جماعت اسلامی کی دعوت میں بھی تذکیر بالقرآن کا بڑا حصہ تھا۔ ان کے اجتماعات میں درسِ قرآن ایک جزوِ لازم کی حیثیت سے شامل رہا اور ویسے بھی تحریک کے اعتبار سے جماعت اسلامی دراصل مولانا آزاد کی تحریک ہی کا ایک تسلسل ہے۔ لیکن پھر سیاست کی دلدل میں پھنسنے کے بعد جماعت اسلامی قرآن حکیم کے فلسفہ و حکمت کی اشاعت کی طرف توجہ نہ دے سکی۔ ہم نے بحمداللہ قرآن حکیم کو مرکز و محور بنا کر مقدور بھر اس کی دعوت و اشاعت اور تذکیر و تفہیم کا کام کیا ہے اور اس سلسلہ کو پچیس برس ہو گئے ہیں۔ میرے دروس و خطابات میں جو چیز سب سے زیادہ بیان کی جاتی ہے وہ قرآن حکیم اور اس کی تفسیر و تشریح ہی تو ہے' جس کا لازمی جزو احادیث نبویہ ہیں، (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) ہمارے معاشرے میں بعض حلقے ایسے بھی ہیں جہاں درسِ قرآن اور خطابِ جمعہ میں اور سب کچھ ہوتا ہے سوائے قرآن کے! نور و بشر اور حاضر و ناظر کے جھگڑوں میں عوام الناس کو الجھایا جاتا ہے۔ حضورؐ کی کملی اور زلفوں کا تذکرہ تو کیا جاتا ہے لیکن آنحضور کی سنّت و سیرت بیان نہیں کی جاتی۔ ایسے علماء کے ہاں جانے والے لوگ تو شاید اللہ کے حضور کوئی عذر پیش کر سکیں کہ یا اللہ ہمارے سامنے تو دین کی یہی تصویر پیش کی گئی تھی اور اسی کو ہم نے اپنا لیا۔ لیکن ہمارے دروس و خطابات میں شرکت کرنے والے احباب سوچ لیں کہ وہ اللہ کے ہاں کیا جواب اور کیا عذر پیش کر سکیں گے؟ یہاں تو

قرآن و سنت کے حوالے سے فرائض دینی کا جامع تصور پیش کیا گیا ہے' قرآن کے ذریعے سے تذکیر کرائی گئی ہے' اسی کی طرف رجوع کی دعوت دی گئی ہے ـــــ لیکن پھر بھی اگر ع "زمین جنبد نہ جنبد گل محمد" والا معاملہ ہو تو پھر قرآن حکیم کی وعید بھی سن لیجئے: **وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا** کہ اُس شخص سے بڑھ کر اور کون ظالم ہوگا جسے اللہ تعالیٰ کی آیات کے ذریعے تذکیر کرائی گئی ـــــــ پھر بھی اس نے اس سے بے اعتنائی کی روش اختیار کی"! اس مقام پر "ثُمَّ" (پھر بھی) کا استعمال خاص طور پر قابل غور ہے۔ عربی کا ذوق رکھنے والے حضرات نوٹ کریں کہ آیت کے اگلے ٹکڑے **"اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ"** میں بجائے فعل کے اسم فاعل لایا گیا ہے۔ اور یہ انتہائی تاکید کا اسلوب ہے۔ یعنی صرف یہی نہیں کہ ہم انتقام لیں گے' بلکہ ترجمہ ہوگا: "یقیناً (ایسے) مجرموں سے تو ہم انتقام لے کر رہیں گے"۔

اب دوبارہ سورۃ الروم کی طرف آیئے! جو شخص اس کام میں لگا ہوا ہے اور تذکیر بالقرآن کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہے' اس کے لئے راہنمائی اس آیہ مبارکہ سے مل رہی ہے: **"فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ"** "پس تم اپنا رخ دینِ قیم کی طرف سیدھا رکھو' قبل اس کے کہ اللہ کی طرف سے ایک ایسا دن آ جائے جس کے لئے پھر واپسی نہیں ہے"ـــــ یعنی تمہارا رخ دین قیم کی طرف سے نہ پھر جائے۔ کہیں مایوس اور دل برداشتہ ہو کر دائیں بائیں مڑنے کا خیال دل میں نہ لانا' جلد بازی میں کوئی غلط طریق کار اختیار کرنے کی نہ سوچنا' بلکہ اس دین کے راستے پر جمے رہو اور ڈٹے رہو' دوسروں تک دین کا پیغام پہنچاتے رہو۔ کوئی مانے یا نہ مانے' تم اپنا کام کرتے چلے جاؤ' تمہارے پائے ثبات میں لغزش نہیں آنی چاہئے۔ **مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ**ـــــــ "اس سے پہلے پہلے کہ اللہ کے حکم سے وہ دن آ جائے کہ جس کے لئے پھر واپسی نہیں ہے"۔ اسے کوئی لوٹانے والا نہیں ہے۔ وہ دن دنیا میں آخری سزا کا دن بھی ہو سکتا ہے۔ ایسے دنوں کو قرآن حکیم میں **"اَيّٰمُ اللّٰهِ"** کہا گیا ہے۔ سورۂ ابراہیم میں فرمایا گیا: **"وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰمِ اللّٰهِ"** "پس (اے نبی!) ان کو اللہ کے دنوں کے حوالے سے یاد دہانی کرایئے"۔ یعنی وہ عظیم دن جن میں مختلف سرکش اقوام اللہ کے فیصلے سے ہلاکت و بربادی سے دوچار کی گئیں۔ قوم نوح کو غرق کیا گیا' قوم ثمود کو ملیا میٹ کر دیا گیا' قوم عاد

ہلاک کی گئی۔ اس کی بربادی کا نقشہ سورۃ الحاقہ میں اس طرح کھینچا گیا ہے کہ "كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ" یعنی "ایسے پڑے تھے جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے پڑے ہوں"۔ اور اس "يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهُ" کا اطلاق روز قیامت پر تو یقینی طور پر ہوتا ہی ہے!

آگے فرمایا: "يَوْمَئِذٍ يَّصَّدَّعُونَ" "اس دن وہ پھٹ جائیں گے!" نوٹ کیجئے کہ یہاں لفظ "يَتَفَرَّقُونَ" (الگ الگ ہو جائیں گے) استعمال نہیں کیا گیا' بلکہ "يَصَّدَّعُونَ" کیا گیا ہے جس کا معنی دھماکے سے پھٹ جانا ہے۔ تفرق کا مفہوم تقسیم ہو جانا' مختلف گروہوں میں بٹ جانا ہے۔ "يَصَّدَّعُونَ" میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا میں لوگ اکثر و بیشتر دنیوی محبتوں کی وجہ سے غلط راستے پر قائم رہتے ہیں ـــــ جیسا کہ سورۃ العنکبوت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول نقل کیا گیا ہے جو انہوں نے اپنی قوم سے کہا تھا: "إِنَّمَا اتَّخَذْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا" ـــــ کہ تم نے جو اللہ کو چھوڑ کر بتوں کو معبود ٹھہرا لیا ہے تو یہ تمہارے باہمی دنیوی تعلقات کی وجہ سے ہے۔ لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ جو شرک ہم کر رہے ہیں یہ صریحاً غلط ہے لیکن برادری' جمعیت' قبیلے اور سیادت و چودھراہٹ ان کے پاؤں کی بیڑیاں بن گئیں کہ اگر ہم یہ معاملہ چھوڑ دیں تو تفرقہ ہو جائے گا اور "A house divided among itself cannot stand" کے مصداق قبیلے اور خاندان تقسیم ہو کر رہ جائیں گے۔ جمعیتیں اور جھوٹی دنیوی محبتیں اور الفتیں لوگوں کو غلط راستہ اختیار کئے رکھنے پر مجبور کر دیتی ہیں' اس کے باوجود کہ ان پر اپنا غلط ہونا واضح ہو چکا ہوتا ہے۔ لیکن قیامت کے روز یہ ساری جمعیتیں ایک دم پھٹ جائیں گی۔ کوئی دوستی اور محبت برقرار نہ رہے گی۔ سورۃ الزخرف میں فرمایا گیا: "الْأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ" "اس دن دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے"۔ اور سورۂ عبس میں نقشہ کھینچا گیا کہ "يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ" "اس دن آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے بھاگے گا"۔ سورۃ المعارج میں فرمایا گیا کہ وہ چاہے گا کہ آج ان سب کو جہنم میں جھونک کر کسی طریقے سے مجھے بچا لیا جائے۔ بہرحال یہاں دنیا میں دوستیاں' محبتیں' الفتیں' حلقہ ہائے احباب اور قرابت داروں کو چھوڑنا ممکن نہیں ہوتا۔ لیکن "يَوْمَئِذٍ يَّصَّدَّعُونَ" ـــــ اس روز وہ باہم پھٹ جائیں گے!

آگے فرمایا: "وَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ" "اور جس نے کفر کیا ہوگا تو اس کے کفر کا وبال اسی کے اوپر ہوگا"۔ یہاں کفر کا لفظ آیا ہے جس کے معانی انکار کے علاوہ ناقدری کے بھی ہیں۔ تکذیب (جھٹلانا) اس سے اگلا مرحلہ ہے۔ چنانچہ بعض مقامات پر یہ دونوں الفاظ ساتھ ساتھ آئے ہیں: "الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا" تاہم یہاں صرف 'کفر' کا لفظ آیا ہے۔ یعنی جنہوں نے آیاتِ ربانی کی ناقدری کی ہوگی وہ اس کفر کے وبال سے بچ نہ سکیں گے۔

"وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ" "اور جس نے نیک عمل کیا تو ایسے لوگ اپنے ہی لئے (دائمی آرام و راحت کا) سامان درست کر رہے ہیں"۔ 'مهد' گود کو بھی کہتے ہیں اور بچھونے کو بھی۔ 'يَمْهَدُوْنَ' کا معنی ہوگا کہ وہ اپنا ہی بسترِ آخرت سنوار رہے ہیں' اپنے ابدی عیش و آرام کے لئے زمین ہموار کر رہے ہیں۔ تمہید کہتے ہیں میدان ہموار کرنے کو۔ آپ کسی خاص مضمون کے لئے ذہنوں کو ہموار کرنے کے لئے جو ابتدائی گفتگو کرتے ہیں اسے تمہید کہتے ہیں۔ تو جو کوئی بھی اس دنیا میں اپنی آخرت سنوارنے کے لئے محنت کر رہا ہے وہ اپنے لئے ہی میدان ہموار کر رہا ہے۔

یہی مضمون سورۃ العنکبوت میں بایں الفاظ آیا ہے: "وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ"۔ "جو کوئی بھی (اللہ کے راستے میں) جہاد کرتا ہے تو وہ اپنے لئے ہی جہاد کرتا ہے' اللہ تو تمام جہانوں سے غنی ہے"۔ وہ بے نیاز ہے' اسے کوئی احتیاج نہیں۔ ایک حدیث قدسی میں اس طرح کے الفاظ آئے ہیں کہ: اے میرے بندو اگر تم اول سے آخر تک تمام جن و انس اپنے میں سے سب سے زیادہ متقی و پرہیزگار بندے کی طرح ہو جاؤ تب بھی میری حکومت و سلطنت میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ اور اگر تم سب کے سب اپنے میں سے سب سے زیادہ نافرمان اور ناشکرے بندے جیسے بن جاؤ تب بھی میری حکومت میں ایک ذرے کی بھی کمی نہیں ہوگی۔ یعنی اگر بالفرض سب کے سب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسے متقی بن جائیں یا سب کے سب ابلیس لعین کی طرح کے ہو جائیں تو اللہ کا نہ کچھ سنوار سکتے ہیں نہ بگاڑ سکتے ہیں۔ جو کفر کا راستہ اختیار کرتا ہے تو اس کا وبال خود اسی پر ہوگا' اور جو عمل صالح کی روش اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے ہی آرام و راحت کا سامان مہیا کر رہا ہے۔

اس سے اگلی آیت میں اس کا نتیجہ بیان کر دیا گیا:

لِيَجْزِيَ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ○

"تاکہ وہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے اپنے فضل سے بدلہ دے۔ بلاشبہ وہ کافروں کو پسند نہیں کرتا"۔

یہاں آیت کے شروع میں جو لام (لِ) ہے وہ لامِ عاقبت ہے۔ یعنی اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل بھی کئے' اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فضل و کرم سے اس کا بدلہ عطا فرمائے گا۔ اور یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت نہیں کرتا۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ اگر آج دنیا میں کافروں کی چلت پھرت ہے اور زمین پر ان کا غلبہ نظر آتا ہے تو یہ ان سے اللہ تعالیٰ کی محبت کی کوئی دلیل ہے۔ سورۂ آل عمران کے آخری رکوع میں فرمایا: "لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ" کہ اے نبی' ملکوں میں کافروں کا دندناتا کہیں آپ کو دھوکے میں نہ ڈال دے! یہ متاعِ قلیل انہیں اس لئے نہیں دی گئی کہ اللہ کو ان سے کوئی محبت ہے۔ چونکہ اہل حق کا کوئی گروہ منظم ہو کر سامنے آیا نہیں ہے اس لئے اللہ نے زمین میں انہیں ڈھیل دے رکھی ہے اور حکومت و اقتدار سے نواز رکھا ہے۔ آخر اس نے اپنی زمین کا کوئی بندوبست کسی نہ کسی کے حوالے تو کرنا ہی ہے۔ حق اگر منظم ہو کر سامنے آ جائے اور اپنا استحقاق ثابت کر دے تو اللہ اسے غلبہ عطا فرمائے گا۔ اللہ کو اِن کافروں سے محبت نہیں ہے کہ زمین کا بندوبست اور انتظام انہی کے سپرد کئے رکھے۔

اب اس آیت کے بالمقابل سورۃ السجدہ کی آیت ملاحظہ ہو:

"وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ"

"اور ہم نے موسیٰ کو بھی کتاب دی تھی' پس تم اس کے ملنے کے بارے میں شک میں نہ رہو' اور ہم نے اس (کتاب) کو بنی اسرائیل کے لئے (ذریعہ) ہدایت بنایا تھا"۔

اس سے پچھلی آیت "وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ۔ الخ" میں اللہ تعالیٰ کی آیات کے ذریعے تذکیر کا ذکر تھا اور ان ظالموں کے لئے وعید بیان ہوئی تھی جنہیں اس طور پر تذکیر کرائی گئی' پھر بھی انہوں نے اس سے روگردانی کی۔ اب چونکہ "فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ" کے مطابق امت کے اندر اس تذکیر کو جاری رکھنا مقصود ہے

لہٰذا اس کے لئے سابقہ امت سے ایک مثال دی جا رہی ہے۔ قرآن حکیم میں جابجا بنی اسرائیل کے برے لوگوں کی مثالیں آئی ہیں۔ سورۃ الجمعہ میں فرمایا گیا: "مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا" کہ مثال ان لوگوں کی جو حاملِ توراۃ بنائے گئے تھے مگر انہوں نے اس کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا' اُس گدھے کی سی ہے جس پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہو۔ لیکن بہرحال بنی اسرائیل میں سب برے ہی برے نہ تھے' ان میں اچھے لوگ بھی تھے۔ ان میں بہت عمدہ اور زبردست شخصیتیں بھی پیدا ہوئیں' بڑے بڑے انبیاء اور ان کے حواریین آئے ہیں۔ تو یہاں ان کے اچھے لوگوں کی مثال دی جا رہی ہے۔

فرمایا: "اور ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا فرمائی تھی ..... اور اس (کتاب یا موسیٰ) کو ہم نے بنی اسرائیل کے لئے ہدایت (کا ذریعہ) بنایا تھا"۔ یہ مضمون سورۂ بنی اسرائیل میں بھی بایں الفاظ آیا ہے: "وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا"۔

سورۃ السجدہ کی مذکورہ بالا آیت کے درمیانی الفاظ "فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ" ایک جملہ معترضہ ہیں' جس کے کئی معانی لیے گئے ہیں مثلاً (i) تم اس بات میں شک میں نہ رہو کہ موسیٰ کو کتاب ملی تھی۔ (ii) شک میں نہ رہو اس بات سے کہ تمہیں اللہ سے ملاقات کرنی ہے۔ (iii) کوئی شک نہ کرو اس بات میں اے محمدؐ! کہ آپ کی ملاقات (شب معراج میں) موسیٰ سے ہی ہوئی تھی۔ یہ مختلف تفسیری معانی ہیں لیکن یہ ایک ضمنی مضمون ہے۔ اس میں اصل مضمون یہی ہے کہ "ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا فرمائی تھی اور اسے بنی اسرائیل کے لئے ہدایت بنایا تھا"۔

اب اگلی آیت میں ہم سب کے لئے نمونہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک چارٹر دیا گیا ہے۔ فرمایا:

"وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ"۔

"اور ہم نے ان میں سے ایسے امام بنائے تھے جو ہمارے حکم سے (لوگوں کی) رہنمائی کرتے تھے۔ جبکہ انہوں نے (راہ حق میں آنے والی سختیوں پر) صبر کیا اور وہ ہماری آیتوں پر یقین کرتے رہے"۔

یعنی ہم نے بنی اسرائیل میں ایسے امام اور پیشوا اٹھائے جو ہماری توفیق اور ہمارے اذن سے لوگوں کی راہبری و راہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتے تھے۔ امام کہتے ہی ان کو ہیں جو آگے چلنے والے ہوتے ہیں' جو صاحبِ عزیمت ہوتے ہیں' جو "مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ" کا نعرہ لگا کر دین اور اس کے لوازم کی یاددہانی کراتے ہیں۔ اس آیۂ مبارکہ کا آخری حصہ بہت اہم ہے جس میں اس امامت اور پیشوائی کی دو لازمی شرائط بیان کر دی گئیں۔۔۔ اور وہ ہیں صبر اور یقین! فرمایا: "لَمَّا صَبَرُوْا وَ کَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یُوْقِنُوْنَ" "جبکہ انہوں نے صبر کیا اور وہ ہماری آیتوں پر یقین کرتے رہے"۔ راہ حق میں درپیش آنے والے مصائب و شدائد پر صبر کرنا اس راہ کی اولین شرط لازم ہے۔ صبر یہ ہے کہ مخالفین کی طرف سے ہر طرح کے تشدد' استہزاء اور تمسخر کو جھیل جانا اور برداشت کرنا اور کسی بھی لالچ یا Temptation کے دباؤ میں نہ آنا۔ گویا ع "میری دنیا لٹ رہی تھی اور میں خاموش تھا!" کی مکمل تصویر بن کر دکھانا' استقامت اور ثابت قدمی سے راہ حق پر جمے اور ڈٹے رہنا' اور اس راہ میں اپنے سارے روشن کیریرز اور مستحکم کاروبار تج کر تن من دھن سے لگ جانا۔ اگرچہ سالہا سال کی محنتوں اور کوششوں کے علی الرغم یہ نظر آ رہا ہو کہ اس کا فی الحال بظاہر کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا' لیکن مایوس اور بددل ہونے کے بجائے اور زیادہ عزم و حوصلے کے ساتھ محنت و کوشش جاری رکھنا۔ یہ تمام چیزیں صبر میں شامل ہیں۔ اور صبر کی اعلیٰ ترین مثال ہمیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ میں نظر آتی ہے۔ آنحضورؐ کی دس برس کی دعوت کے نتیجے میں ایک چھوٹی سی جمعیت قائم ہوئی تھی۔ حالانکہ دعوت دینے والے تاریخ انسانی کی عظیم ترین شخصیت' سید المرسلین' خاتم النبیّین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود تھے۔ لیکن پورے دس برس کی جانفشانی کے بعد صورت احوال بظاہر اس قدر مایوس کن تھی کہ مکہ کی سرزمین آپ پر تنگ ہو گئی' آپ کے قتل کا فیصلہ ہو گیا اور آپ کو طائف کا سفر اختیار کرنا پڑا۔ لیکن طائف میں آپ کے ساتھ ایک ہی دن میں وہ اذیت ناک سلوک روا رکھا گیا کہ ایسا کربناک دن آپ کی حیات طیبہ میں نہ اس سے پہلے آیا اور نہ اس کے بعد۔ اور آپ کو اس حالت میں مکہ واپس آنا پڑا کہ ایک مشرک کی امان لے کر داخلہ ممکن ہوا! لیکن بظاہر احوال اس قدر مایوس کن حالات میں بھی آپ کے پائے استقلال میں کوئی لرزش نہیں آئی۔ اس طرح

کے حالات میں بھی حکم یہی ہے: "فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ" "آپ اپنا رخ دینِ قیم کی طرف سیدھا رکھئے"۔ دین پر قائم رہئے اور اسے قائم کرنے کی جدوجہد جاری رکھئے۔ راہ حق پر جمے رہئے' ڈٹے رہئے' مایوسی اور بددلی کو قریب مت آنے دیجئے' استقامت کا ثبوت دیجئے۔ یہ ہے اس راہ کی دو لازمی شرائط میں سے شرط اول' جسے یہاں سورۃ السجدہ میں "لَمَّا صَبَرُوْا" کے الفاظ میں بیان فرمایا گیا۔

اور دوسری شرط آگے بیان فرمائی: "وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ" "اور وہ ہماری آیات پر یقین رکھتے تھے!" اللہ کی نازل کردہ کتاب پر ایمان اس راہ کی دوسری شرط لازم ہے۔ یہی ہے دراصل "اَلْعُرْوَةُ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا" — وہ مضبوط سہارا جو ٹوٹ نہیں سکتا۔ یہی ہے اللہ کی وہ رسی جسے مضبوطی سے تھامنے کا حکم دیا گیا۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: "قرآن اللہ کی مضبوط رسی ہے جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ہے"۔ اس پر ایمان رکھو' اس کو تھامو اور جمے اور ڈٹے رہو۔ یہ خود سرچشمۂ ایمان و یقین ہے۔ اور اسی کتابِ ہدایت کی دعوت دنیا کے سامنے پیش کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق اور استقامت دیئے رکھے۔

آگے فرمایا: "اِنَّ رَبَّكَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ"

"یقیناً تمہارا رب قیامت کے دن ان باتوں کا فیصلہ کردے گا جن میں یہ آپس میں اختلاف کرتے رہے ہیں"۔

دنیا میں جو بھی اختلافات ہو رہے ہیں' آپ کا رب قیامت کے دن فیصلہ کردے گا کہ کون صحیح اور کون غلط تھا۔ قیامت تو آکر رہنی ہے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی: "اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ"۔ (الحجر) "قیامت تو یقیناً آنے والی ہے۔ پس (اے نبی' ان سے) حسن و خوبی کے ساتھ درگزر کیجئے!" ان کے تمسخر و استہزا کو نظرانداز کیجئے' ان کی باتوں کا برا نہ مانئے' بددل نہ ہوں۔ "وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ"۔ "ہمیں خوب معلوم ہے کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں اس سے آپ کا سینہ بھنچتا ہے"۔ لیکن آپ ڈٹے رہئے' جمے رہئے' قیامت آئے گی تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔

یہ ہیں قرآن حکیم کے وہ دو انتہائی جامع مقامات جن میں موجودہ حالات کی عکاسی بھی ہے' ان اسباب کا بیان بھی ہے جن کے باعث ہم اس سنگین صورت حال سے دوچار ہیں،

(باقی صفحہ ۳۰ پر)

نشری تقریر

ڈاکٹر اسرار احمد

درسِ قرآن

سُورۃ ابراہیم آیات ۲۸ تا ۳۰

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم

اَمَّا بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ کُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَھُمْ دَارَ الْبَوَارِ ○ جَھَنَّمَ ۚ یَصْلَوْنَھَا ۭ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ○ وَجَعَلُوْا لِلّٰہِ اَنْدَادًا لِّیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِہٖ ۭ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِیْرَکُمْ اِلَی النَّارِ ○ صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْم۔

"کیا تم نے ان لوگوں کے حال پر غور نہیں کیا جنہوں نے اللہ کی نعمت کا بدلہ ناشکری سے دیا۔ اور اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں جا اتارا۔ یعنی جہنم میں، جس میں وہ داخل ہوں گے، اور کیا ہی بُرا ہے وہ ٹھکانہ۔ اور انہوں نے اللہ کے کچھ مدِ مقابل گھڑ لیے تاکہ اُس کے راستے سے بھٹکا سکیں۔ ان سے کہہ دو، چند سے عیش کر لو، بالآخر تو تمہیں جہنم ہی میں جانا ہے۔"

ان آیاتِ مبارکہ میں شرک اور اہلِ شرک کے بارے میں بعض نہایت اہم اور بنیادی حقیقتیں بیان ہوئی ہیں ـــــ اوّلین یہ کہ توحید کی اصل بنیاد اللہ تعالیٰ کا شکر ہے اور شرک کی جڑ ناشکری ہے۔ جیسے کہ سورۂ لقمان میں ارشاد ہوا کہ:

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِکْمَۃَ اَنِ اشْکُرْ لِلّٰہِ ۭ وَمَنْ یَّشْکُرْ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِہٖ ۚ وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ○ وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِہٖ وَھُوَ یَعِظُہٗ یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِکْ بِاللّٰہِ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ○

"اور ہم نے لقمان کو دانائی عطا فرمائی کہ کر شکر اللہ کا ـــــ اور جو (اللہ کا) شکر کرتا ہے تو اپنے ہی بھلے کو کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے تو اللہ تو ہے ہی غنی اور حمید۔ اور یاد کرو جب کہا لقمان نے اپنے بیٹے سے اور وہ اسے نصیحت کر رہے تھے کہ اے میرے بچے اللہ کے ساتھ شرک نہ کیجیو بے شک شرک بہت بڑی ناانصافی ہے!"

اسی طرح یہاں فرمایا: "کیا تم نے غور نہیں کیا ان لوگوں کے حال پر جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر بجائے شکر کے، ناشکری کی روش اختیار کی" ـــــ گویا اصل میں یہی کفرانِ نعمت ہے جو شرک اور کفر کی راہ ہموار کرتا ہے!

دوسری اور اہم ترین حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ کفر اور شرک کا فروغ اس لیے نہیں ہوتا کہ یہ مطابقِ فطرت ہے، بلکہ اس لیے ہوتا ہے کہ کچھ ہوشیار اور چالاک اور مفاد پرست عناصر اپنے ناجائز مصالح و منافع کے پیشِ نظر سادہ لوح عوام کو بے وقوف بناتے ہیں اور ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اور انہیں توہمات میں مبتلا کر کے اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔ اور اس طرح اپنی سیادت و قیادت کی گدّیوں کی حفاظت کرتے رہتے ہیں خواہ اس طرح اپنے ساتھ پوری قوم کو بھی جہنم ہی میں جا اتاریں۔ یہ بات قرآن مجید میں بھی بہت سے مواقع پر اور متعدد اسالیب سے آئی ہے اور خود تاریخ انسانی بھی اس پر شاہدِ عادل ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی مکّی سورتوں میں بار بار یہ بات آتی ہے کہ حضراتِ انبیاء و رُسل کی مخالفت میں ان کی قوموں کے سردار اور چوہدری ہی پیش پیش رہے جنہیں قرآن "ملأ" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ چنانچہ صرف ایک سورۃ الاعراف میں اس حقیقت کا ذکر سات مرتبہ آیا ہے۔ کہیں "قَالَ الْمَلَأُ مِن قَوْمِهِ" کے الفاظ میں، کہیں "قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا" کے الفاظ میں اور کہیں "قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا" کے الفاظ میں۔ انہی طبقات کو قرآن مجید بعض مقامات پر "مترفین" کے لفظ سے تعبیر فرماتا ہے، یعنی دولت مند اور خوشحال لوگ جو اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی نعمتوں میں سے اپنے حق سے زائد وصول کرتے ہیں اور اس کے لیے نت نئے توہمات کا جال پھیلا کر عوام کو اس میں گرفتار کیے رکھتے ہیں تاکہ وہ اصل حقائق کی جانب متوجہ ہی نہ ہو سکیں ـــــ اور اس طرح پوری پوری قوموں کی ابدی ہلاکت و بربادی کا سبب بن جاتے ہیں۔

تاریخی اعتبار سے بھی ثابت ہے کہ جن جن معاشروں میں شرک ایک باقاعدہ نظام کی حیثیت

سے رائج رہا ہے وہاں یہی صورت رہی ہے کہ ایک جانب تو حکمرانوں نے عوام کی گردنوں پر اپنی خدائی کا تخت جمایا اور اپنے لیے خدائی اختیارات کا دعویٰ کیا، جیسے یورپ اور انگلستان میں جہاں "Divine Rights of Kings" کا دعویٰ کیا گیا اور مصر اور ہندوستان میں جہاں بادشاہوں نے دیوتاؤں کے ساتھ نسلی و نسبی تعلق کے دعوے کی بنیاد پر خدائی اختیارات پر قبضہ جمایا۔ چنانچہ ہندوستان کے حکمران خاندان سورج بنسی یا چندر بنسی کہلاتے تھے ـــــ اور دوسری طرف پجاریوں اور پروہتوں نے فرضی دیوتاؤں کے نام پر استھان بناتے اور لوگوں سے چڑھاوے اور نذرانے وصول کرنے کا سامان پیدا کیا۔ یا کچھ مذہبی ٹھیکیداروں نے خدا کی نمائندگی کے دعوے کی بنیاد پر حلت و حرمت کے اختیار سنبھال لیے اور معافی ناموں کی فروخت کے ذریعے دولت کمائی۔ اس طرح عوام الناس کا خون چوسنے اور ان کے گاڑھے پسینے کی کمائی میں سے ناجائز حصہ وصول کرنے کا یہ دو طرفہ نظام اس شان کے ساتھ چلتا رہا کہ دونوں طبقات ایک دوسرے کے ممد و معاون بنے رہے اور "من ترا حاجی بگویم تو مرا ملا بگو!" کے مصداق ایک دوسرے کو اعلیٰ ترین القابات و خطابات سے نوازتے ہوئے "نصفٌ لی و نصفٌ لک و ہٰذا قومٌ جاہلون" کے اصول پر انہوں نے عوام کے استحصال کے لیے ایک ناپاک گٹھ جوڑ کیے رکھا!! ـــــ

چنانچہ یہی ہے وہ تیسری عظیم حقیقت جو ان آیات میں سامنے آتی ہے کہ اللہ کے لیے شریک اور ساجھی اور خیالی ضِدّ و نِدّ ان مذموم مقاصد کے لیے باقاعدہ گھڑے جاتے رہے ہیں اور ان کی باضابطہ تصنیف ہوتی رہی ہے۔ ورنہ ان کی نہ کوئی اصل عقل و فطرت میں ہے نہ کوئی سند اللہ کی جانب سے نازل کی گئی ہے۔ اس حقیقت کو قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر مختلف پیرایوں میں بیان فرمایا ہے۔ مثلاً سورۃ النجم میں فرمایا: "اِنْ ھِیَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْھَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُکُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰہُ بِھَا مِنْ سُلْطٰنٍ" ـــــ یعنی یہ محض نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباء و اجداد نے رکھ لیے ہیں، ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہرگز کوئی سند نہیں اتاری۔ سورۃ لقمان اور سورۃ العنکبوت میں فرمایا کہ اگر تمہارے والدین تم سے جھگڑیں اور تمہیں اس بات پر مجبور کریں کہ "اَنْ تُشْرِکَ بِیْ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْھُمَا" ـــــ کہ تو شریک ٹھہرائے میرے ساتھ ایسی خیالی و جعلی ہستیوں کو جن کے لیے کوئی علم تیرے پاس

نہیں ہے تو اُن کا کہنا مت مان! یعنی ان کے لیے کوئی دلیل عقلی ہے نہ علمی۔

پھر یہ کہ یہ تمام جعلسازی کسی مغالطے کی بنا پر نہیں ہوتی، اچھی طرح جانتے بوجھتے اور پوری ڈھٹائی کے ساتھ اس مقصد سے کی جاتی ہے کہ عوام کو گمراہ کیا جائے۔ جس کے لیے آیاتِ زیر درس میں الفاظ وارد ہوئے ہیں "لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيلِهٖ"۔

آخری عظیم حقیقت یہ کہ اس ساری جعلسازی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ متاعِ دُنیا سے بڑھ چڑھ کر حصّہ حاصل کیا جائے، سازوسامانِ دنیوی زیادہ سے زیادہ جمع کر لیا جائے اور حیاتِ دنیوی کی لذتوں اور آسائشوں سے بیش از بیش لُطف اندوز ہوا جائے۔ چنانچہ آیت ۳۰ کے آخری حصّے میں بڑے عبرتناک پیرائے میں کہہ دیا گیا کہ "قُلْ تَمَتَّعُوْا" یعنی اے نبیؐ، ان سے کہہ دیجیے کہ اُٹھا لو چند روزہ زندگی کے مزے اور لوٹ لو اس عارضی زندگی کا عیش و آرام! "فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ"۔ اس لیے کہ بالآخر تو تمہیں جہنّم ہی میں جھونکے جانا ہے!! اس میں جہاں اُن کے دردناک انجام کی "بشارت" آگئی وہاں اس عظیم حقیقت پر سے بھی پردہ اٹھا دیا گیا کہ اس حیاتِ دنیوی کے لیے اللہ تعالیٰ کا ضابطہ اور قانون یہی ہے کہ چونکہ اُس نے انسان کو ارادے اور اختیار کی آزادی بخشی ہے، لہٰذا یہاں نہ صرف یہ کہ کفار و مشرکین کی فوری پکڑ نہیں ہوتی بلکہ جو "متاعِ غرور" کا سودا وہ کرتے ہیں اور آخرت کی ابدی زندگی کے عوض دنیا کی چار روزہ زندگی کا جو عیش و آرام وہ خریدتے ہیں اُس کے معاملے میں اُن کے ساتھ بخل نہیں برتا جاتا بلکہ انہیں اس میں سے حصّہ وافر عطا فرما دیا جاتا ہے۔ جیسے کہ سورۂ ہود کی آیت ۱۵ میں فرمایا کہ "مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ"۔ یعنی "جو کوئی اپنا مقصود و مطلوب قرار دیتا ہے دُنیا کی زندگی اور اس کی زیبائشوں اور آرائشوں کو تو ہم اس کی سعی و جہد کا بھرپور بدلہ اسی دُنیا میں دے دیتے ہیں اور اس کے ضمن میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی"۔ اور جیسے فرمایا سورۂ شوریٰ میں "وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ"۔ یعنی "جو دُنیا کی کھیتی ہی کا طالب بنتا ہے تو اسے ہم اس میں سے عطا کر دیتے ہیں، البتہ پھر اُس کے لیے آخرت میں کوئی حصّہ نہیں رہتا"۔ "فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ"۔ یعنی "آخرت کے

(باقی صفحہ ۳۰ پر)

سورۃ البقرہ، آیات ۲۵۹-۲۶۰

دعوت کی فتحیابی کی امید آخر تک رہتی ہے

دعوت کا کام بڑا نازک اور بڑی پتہ ماری کا ہوتا ہے۔ انسان بہت جلدی گھبرا جاتا اور مایوس ہو جاتا ہے۔ ان آیتوں میں دو واقعات بیان کیے گئے ہیں جن میں اور حقیقتوں کو ثابت کرنے کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس راہ (دعوت) میں مایوسی کی گنجائش کسی وقت اور کسی مرحلہ میں نہیں ہے۔ مردہ قوموں میں جان پڑنے کے واقعات سے تاریخ بھری ہوئی ہے۔

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۖ فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ ۖ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۖ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۖ وَانظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ ۖ وَانظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٥٩﴾ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۖ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن ۖ قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي ۖ قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا ۚ وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٦٠﴾

"یا کیا آپ نے اُس شخص کی حالت پر غور نہیں کیا جو ایک بستی سے گذرا تھا، جس کے مکانوں کی چھتیں گر چکی تھیں۔ اس نے کہا کہ اللہ اس بستی کو دوبارہ

کیونکر زندہ (آباد) کرے گا؟ پھر اللہ نے اس پر سو برس تک موت طاری کر دی، پھر اسے اٹھایا (زندہ کیا) اس سے پوچھا کہ تم کتنی مدت اس حالت میں رہے؟ جواب دیا: ایک دن یا اس سے کچھ کم رہا! اللہ نے فرمایا: (نہیں) بلکہ تم سو برس رہے۔ اب تم اپنا کھانا اور پانی دیکھو کہ وہ سڑے نہیں ہیں اور اپنے گدھے کو دیکھو (کہ وہ کس حالت میں ہے) اور ہم تمہیں لوگوں کے لیے ایک "نشانی" بنائیں گے (کہ تم ان کے لیے ہدایت کا ذریعہ بنو) اور (گدھے کے جسم کی) ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم ان کا کس طرح ڈھانچہ بنا کر کھڑا کر دیتے ہیں، پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ جب یہ حقیقت اُس کے سامنے آگئی تو عرض کیا میں یقین کرتا ہوں کہ بیشک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے![1]

اور جب ابراہیمؑ نے کہا اے میرے پروردگار آپ مجھے دکھا دیجئے کہ آپ مُردہ کو کیسے زندہ کریں گے؟ فرمایا کہ کیا تمہیں یقین نہیں ہے؟ عرض کیا کیوں نہیں، لیکن یہ اس لیے چاہتا ہوں کہ میرے دل کو قرار آجائے۔ فرمایا: تم چار پرندے پکڑ لو، پھر انہیں ہلا لو (خود سے مانوس کر لو) ہر پہاڑ پر ان کے جسم کا ایک حصّہ رکھ دو، پھر ان کو بلاؤ تو وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے اور یقین رکھو کہ بیشک اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے![2]

---

[1] قرآن ایک حقیقت کو بیان کرتا ہے لیکن اس کے اندازِ بیان میں بہت سی باتیں پوشیدہ ہوتی ہیں، جن کو کھولنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان دونوں آیتوں میں مرنے کے بعد انسان کی دوسری زندگی کو ثابت کیا گیا ہے۔ اسی میں قوموں کی موت کے بعد ان کی زندگی کا ثبوت بھی ہے کہ جو قدرت انسانوں اور جانوروں کو مرنے کے بعد زندہ کرتی ہے وہی ذلّت وخواری کی موت کے بعد قوموں کو ایمانی واخلاقی اور ترقی وسربلندی کی زندگی دیتی ہے۔ اِس بناء پر دعوت کا کام ہمیشہ کرتے رہنا چاہیئے اور فتح یابی کی امید آخر دم تک رکھنا چاہیئے۔ پہلی آیت کا واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک ظالم وجابر بادشاہ نے بنی اسرائیل اور ان کے شہروں وبستیوں

کو بالکل تباہ و برباد کر دیا تھا۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی اور مایوسی ہی مایوسی نظر آرہی تھی زندگی کے آثار دُور دُور نہ دکھائی دیتے تھے۔ انہی شہروں اور بستیوں میں سے کسی ایک پر اللہ کے ایک مومن بندہ کا گذر ہوا، جس کو اللہ کی دعوت کا کام کرنا تھا۔ اس نے ہر طرف تباہی و بربادی دیکھ کر یہ سوال کر ڈالا کہ بھلا کیسے اللہ ان میں زندگی کی رُوح پھونکے گا اور یہ اُٹھ کھڑے ہوں گے؟

(عام مفسّرین کا خیال ہے کہ یہ بادشاہ "بخت نصر" تھا اور یہ اللہ کا بندہ حضرت عزیر علیہ السّلام تھے۔ قرآن میں نہ اس کی صراحت ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ قرآن کا مقصود نام لیے بغیر بھی حاصل ہے۔) اس سوال کا جواب جس انداز سے دیا گیا ہے اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال کا تعلق ان دو باتوں سے تھا، تاکہ پہلی کے ذریعہ دوسری بات کو سمجھا جائے :۔

(۱) انسانوں کے مرنے اور گلنے سڑنے کے بعد قیامت میں ان کو دوسری زندگی کیونکر حاصل ہوگی؟

(۲) ایسی ذلّت و خواری کی موت کے بعد دنیا میں ایمانی و اخلاقی زندگی کیسے پیدا ہوگی اور ان کو ترقی و سربلندی کیوں کر حاصل ہوگی؟

سوال ہمیشہ شکوک و شبہات کی بنا پر نہیں ہوتا ہے (حضرت عزیرؑ سے اس کی توقع بھی نہ تھی) بلکہ اللہ کی قدرت پر حیرت و تعجب کے اظہار کے لیے بھی ہوتا ہے، تاکہ جواب سے ان لوگوں کو رہنمائی حاصل ہو جو شکوک و شبہات میں مبتلا ہوتے ہیں یا زیادہ وضاحت سے بات کو سمجھنا چاہتے ہیں۔

اللہ کی طرف سے سوال کا جو جواب دیا گیا وہ زبانی سے زیادہ عملی تھا۔ سو سال تک موت طاری رہنا، پھر صحیح و سالم اُٹھ کھڑا ہونا، اسی طرح خراب ہونے والی چیزوں (کھانا اور پانی) کا نہ خراب ہونا اور جو خراب ہوئی ہے (گدھا) اس کے بعض حصّے (ہڈیاں) روک کر اپنی قدرت کے کرشمے دکھانا (ان پر گوشت و پوست چڑھانا) —— یہ سب کچھ یہی دکھانے کے لیے تھا کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، مرنے کے بعد کی دوسری زندگی ہو یا ذلّت و خواری کی موت کے بعد ترقی و سربلندی کی زندگی ہو۔

سو سال تک موت طاری کرنے کی مدّت غالباً اس لیے تجویز ہوئی کہ اس مدّت میں بنی اسرائیل نے اپنے کو سنبھال لیا تھا اور ہر قسم کی ترقی و سربلندی انہیں حاصل ہو گئی تھی۔ شہر یا بستی سے مراد

اگر بیت المقدس ہے (جیسا کہ بعض مفسّرین کا خیال ہے) تو تباہی و بربادی کے بعد اس کی آبادی اور تعمیر و ترقی میں سو برس لگے تھے۔ جس بستی کو دیکھ کر سوال پیدا ہُوا تھا اب اس میں ہر طرف زندگی ہی زندگی تھی۔

۲۔ دوسری آیت کا واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے زمانہ میں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ کفر و شرک اور بدعات و خرافات نے پورے معاشرہ کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ کسی طرف نہ حق کی آواز سنائی دیتی اور نہ حق بات قبول کرنے کی استعداد دکھائی دیتی تھی۔ ایسی حالت میں فطری طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ بھلا ان مردہ لوگوں میں ایمانی و اخلاقی زندگی کی روح کیسے پڑے گی اور ان بے جان لوگوں میں دعوت کی کامیابی و فتح یابی کیونکر ہوگی؟ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی تسلّی کے لیے اللہ سے عرض کیا کہ آپ مجھے دکھا دیجئے کہ مردہ کو کیسے زندہ کرتے ہیں؟ تاکہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں کہ جو قدرت مردہ کو زندہ کرتی ہے وہ مردہ قوموں کو بھی زندگی دے گی۔ حضرت ابراہیمؑ سے کہا گیا کہ کیا مُردہ کے زندہ کرنے پر تمہارا ایمان و یقین نہیں ہے؟ عرض کیا بیشک ایمان و یقین ہے، لیکن آنکھوں کے سامنے زندہ کرنے کا منظر دیکھ کر دل کو قرار آئے گا اور اس مردہ قوم میں دعوت کے ذریعہ زندگی کی روح دوڑانے کی ہمّت ہوگی۔ پھر اللہ نے حکم دیا کہ چار چڑیوں کو لے کر انہیں خوب ہلا لو، پھر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ایک ایک ٹکڑا قریبی پہاڑیوں پر رکھ دو۔ پھر انہیں آواز دے کر بلاؤ وہ تمہارے پاس دوڑتی ہوئی آجائیں گی۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور چڑیوں کے زندہ ہونے کا منظر دیکھ لیا۔ اس مثال سے ایک طرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ جس طرح اللہ نے ان چڑیوں کو مرنے اور ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بعد زندہ کیا ہے اسی طرح اللہ مُردہ انسانوں کو زندہ کرے گا۔ اور دوسری طرف یہ دکھانا ہے کہ جس طرح چڑیوں کی تربیت کر کے ان کو اس قدر ہلایا اور مانوس بنایا جاتا ہے کہ مرنے اور ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے بعد بلانے سے وہ آواز سن کر آجاتی ہیں، اسی طرح انسانوں کی تربیت کر کے انہیں ہلایا اور مانوس بنایا جاسکتا ہے اور ان میں زندگی کی روح دوڑائی جاسکتی ہے۔ ان سے مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں ہے، دعوت کا کام آخر دم تک کرتے رہنا چاہیئے۔

قاضی عیاض مالکی

قاضی عیاض ۴۷۶ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق قریہ سبتہ سے تھا، جو مغرب کا ایک مشہور شہر ہے[۱] قاضی عیاض نے جن اساتذہ سے استفادہ کیا، اس کی تفصیل حافظ ذہبی (م ۷۴۸ھ) نے 'تذکرۃ الحفاظ' میں درج کی ہے[۲] اپنے وطن کے علماء سے استفادہ کے بعد اندلس تشریف لے گئے اور قرطبہ کے علماء سے اکتسابِ فیض کیا۔ بعد ازاں بلادِ مشرق کا سفر بھی کیا[۳]

قاضی عیاض کے حفظ و ضبط، ذکاوت و ذہانت اور فہم و تیقن کا علماءِ کرام نے اعتراف کیا ہے۔ اُن کی غیر معمولی فطانت کا یہ حال تھا کہ ۳۵ سال کی عمر میں قاضی مقرر ہوئے[۴] قاضی عیاض کو علمِ حدیث سے خاص شغف تھا اور اس فن میں مکمل مہارت اور درک رکھتے تھے۔ علامہ ابنِ خلکان (م ۶۸۱ھ) لکھتے ہیں کہ:

"حدیث اور علومِ حدیث میں یکتائے روزگار اور امامِ وقت تھے اور حدیثوں کے ضبط و تحریر اور جمع و کتابت پر پوری توجہ مبذول کرتے تھے۔ اس لیے اُن کے پاس روایات و احادیث کا کافی ذخیرہ تھا[۴]

حدیث کے علاوہ قاضی عیاض فقہ اور علومِ فقہ میں بھی ممتاز تھے۔ علامہ ابنِ فرحون مالکی (م ۷۹۹ھ) لکھتے ہیں کہ:

"قاضی عیاض تفسیر اور اس کے متعلقہ علوم و فنون کے عالم، مبصر فقیہ اور احکام و شرائع کے بڑے واقف کار تھے، اور اس کے ساتھ بلیغ خطیب بھی تھے"[۵]

قاضی عیاض صرف دینی علوم ہی میں ممتاز اور فائق نہ تھے۔ بلکہ نحو، لغت، کلامِ عرب

اور انساب کے بھی نامور عالم تھے۔ ابنِ خلکان (م ۶۸۱ھ) نے ان علوم میں ان کو امام العصر قرار دیا ہے[۶]

قاضی عیاض امام مالک بن انس (م ۱۷۹ھ) کے فقہی مذہب سے وابستہ تھے۔ مذہب مالکی کے اصول و فروع پر ان کی گہری نظر تھی اور اس مذہب کی جزئیات کے حافظ تھے[۷]

قاضی عیاض اخلاق و عادات میں بہترین خصائص کے حامل تھے۔ انکسار و تواضع، خوش معاملگی، صبر و ضبط، عفو و تحمل، سخاوت اور فیاضی میں بہت مشہور تھے۔ خشیتِ الٰہی، عملِ صالح میں مداومت اور حق کے معاملہ میں شدت پسندی کے لیے مشہور تھے، اور اس کے ساتھ نہایت متقی، پرہیزگار، عبادت گزار، صحیح العقیدہ اور بدعات سے سخت متنفر تھے[۸]

قاضی عیاض ۳۵ سال کی عمر میں عہدۂ قضاء پر متمکن ہوئے۔ آپ نے محکمۂ قضاء کے فرائض نہایت خوش اسلوبی اور ذمہ داری سے انجام دیئے اور جب تک قاضی رہے عدل و انصاف سے سرِ مو انحراف نہیں کیا[۹]

موحدین[ع] کی تحریک کا ظہور ہوا تو قاضی عیاض اس تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ ۵۴۳ھ کے انتشار اور طوائف الملوکی کے زمانہ میں ان کو جلاوطن ہو کر مراکش جانا پڑا۔ وہیں ان کا جمادی الاخریٰ ۵۴۴ھ میں انتقال ہوا[۱۰]

ع اس تحریک کے بانی محمد بن تومرت سوس میں پیدا ہوئے۔ یہ نہایت لائق اور عالم و فاضل شخص اور امام غزالی (م ۵۰۵ھ) کے تلامذہ میں سے تھے۔ ۵۱۵ھ میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی دعوت کا آغاز کیا۔ جب ان کا حلقۂ اثر زیادہ وسیع ہوا تو انہوں نے مہدویت کا دعویٰ کر دیا۔ عبدالمؤمن کو جو ان کا خاص معتقد اور مرید تھا ۵۲۰ھ میں اپنی وفات سے پہلے اپنا جانشین مقرر کر گئے۔ اس نے اندلس اور بلاد مغرب سے مرابطین کی حکومت کا خاتمہ کر کے ان کو اپنے زیرِ نگیں کر لیا۔ ۶۲۰ھ تک الموحدین کی حکومت ان علاقوں میں رہی (عراقی)

تصنیفات

قاضی عیاض صاحبِ کمال اور نامور مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات علم و فن کے ذخیرہ میں بیش قیمت اضافہ کی جاتی ہیں۔ علامہ ذہبی (م ۷۴۸ھ) لکھتے ہیں کہ:

"قاضی عیاض کی تصنیفات کا چار دانگِ عالم میں شہرہ ہُوا۔ ان کی بدولت ان کا نام روشن ہُوا اور ان کی دُور دُور شہرت ہوئی۔ ان کے وطن میں ان کے زمانہ میں کسی شخص نے اتنی کتابیں نہیں لکھی تھیں۔"[1]

اکمال العلم فی شرح صحیح مسلم : یہ امام مسلم (م ۲۶۱ھ) کی صحیح مسلم کی شرح اور علامہ ابو عبداللہ محمد بن علی مازری (م ۵۳۶ھ) کی مشہور شرح مسلم "کتاب العلم بفوائد کتاب مسلم" کا تکملہ ہے۔ اکمال العلم کا شمار صحیح مسلم کی مشہور شرحوں میں ہوتا ہے۔

مشارق الانوار : اس کا پورا نام "مشارق الانوار علی صحاح الآثار" ہے۔ یہ حدیث کی تین اہم اور طبقۂ اولیٰ کی کتابوں، موطأ امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی شرح ہے۔ اس میں ان کی حدیثوں کے مشکل اور غریب الفاظ کی تحقیق و تشریح، معانی و مطالب کی توضیح اور راویوں کے ناموں کا ضبط اور ان کے اغلاط، اوہام اور تصحیفات وغیرہ پر تنبیہ کی گئی ہے۔

کتاب الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ : یہ قاضی عیاض کی بڑی مشہور، مقبول اور بے نظیر کتاب ہے۔ اس میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ شان اور آپ کے جلیل القدر منصب و مقام کو قرآن مجید، حدیثِ نبوی اور ائمہ کرام کے اقوال کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے۔

---

[1] سمعانی، کتاب الانساب ورق ۲۸۹ — ابن فرحون مالکی، الدیباج المذہب ص ۱۸۶۔

[2] ذہبی، تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۹۹ — ابن خلکان، وفیات الاعیان ج ۲ ص ۱۰۷
شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، بستان المحدثین ص ۱۳۱۔

[3] ابن فرحون مالکی، الدیباج المذہب ص ۱۶۹۔

ﮥ ابنِ خلکان، وفیات الاعیان ج ۲ ص ۱۰۶ -

ﮥ ابن فرحون مالکی، الدیباج المذہب ص ۱۶۹ - ﮥ ابن خلکان وفیات الاعیان ج ۲ ص ۱۱۶ -

ﮥ ابنِ فرحون مالکی، الدیباج المذہب ص ۱۶۹ -

ﮥ ابن فرحون مالکی، الدیباج المذہب ص ۱۶۹ - ذہبی، تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۰۰،

ﮥ ابنِ خلکان وفیات الاعیان ج ۲ ص ۱۰۷ -

ﮥ ابنِ فرحون مالکی، الدیباج المذہب ص ۱۷۰ - ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج ۴ ص ۱۰۱ -
ابن خلکان، وفیات الاعیان، ج ۲ ص ۱۱۸ - محمد بن جعفر کتانی، الرسالۃ المستطرفہ ۸۹ -

ﮥ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج ۴ ص ۱۰۰ -

بقیہ: "حکم و عبر"

اور بھرپور رہنمائی بھی موجود ہے کہ ان حالات میں ہمیں کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور ہمیں توفیق دے کہ ہم قرآن حکیم کو واقعتاً اپنا رہنما اور مشعلِ راہ بنالیں (آمین)

○

بقیہ: "نشری تقریر"

مقابلے میں دنیا کا مال و متاع بالکل کچھ نہ ہونے کے حکم میں ہے!" بقول علامہ اقبال ؎

یہ مال و دولتِ دُنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں، لا الٰہ الاّ اللہ!

اللہ تعالیٰ ہمیں شرک کی جملہ اقسام سے بچنے اور دُنیا پرستی کے جال میں پھنسنے سے بچائے آمین!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

حکمتِ اقبال (۳۰)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

خودی اور عقل

حقیقتِ عقل کا صحیح نظریہ

اوپر ہم دیکھ چکے ہیں کہ اقبال کے فلسفۂ خودی کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ انسان خدا کی محبت کا ایک طاقتور جذبہ ہے، جسے سوچنے کے لیے ایک دماغ اور کام کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں دے دیئے گئے ہیں۔ چونکہ خدا کی محبت ہی انسانی خودی کے تمام افکار و اعمال کا سرچشمہ ہے لہٰذا ظاہر ہے کہ عقل انسانی زندگی میں محض ایک ثانوی کردار ہی ادا کر سکتی ہے۔ اس کے وجود کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ محبت کی خدمت اور اعانت کرے اور وہ اسی مقصد کو پورا کرتی ہے۔ زندگی یا خودی کا اصل سرمایہ خدا کی آرزو ہے۔ عقل اس آرزو کی پیداوار ہے۔

زندگی سرمایہ دار از آرزوست　　عقل از زائیدگانِ بطنِ اوست

خدا کا عشق خودی کا امام ہے اور عقل خودی کی غلام ہے۔

من بندۂ آزادم، عشق است امامِ من　　عشق است امامِ من، عقل است غلامِ من

عقل محض ایک قوت ممیزہ ہے، جو خودی کو اس کے نصب العین کے حصول کے لیے جدوجہد کرنے میں مدد دیتی ہے۔ نصب العین کسی تصور کے حسن کا ایک اندازہ ہوتا ہے جو خودی کو براہِ راست اپنے وجدان کی مدد سے کرنا پڑتا ہے۔ وجدان درحقیقت آرزوئے حسن کا ہی دوسرا نام ہے، جو بالعموم اس وقت برتا جاتا ہے جب آرزوئے حسن کسی چیز کے خوب و زشت، حق و باطل یا نیک و بد کے متعلق فیصلہ صادر کر رہی ہو اور اپنے لیے علم بہم پہنچانے کا وظیفہ ادا کر رہی ہو۔

ہر تصورِ حسن ایک وحدت ہوتا ہے جس کے حسن کو براہِ راست محسوس کیا جا سکتا ہے۔ آرزوئے

حسن اپنے فیصلے خود کرتی ہے، وہ عقل یا کسی اور قوت کے فیصلے قبول نہیں کرتی اور در اصل انسان کے پاس آرزوئے حسن کے علاوہ کوئی اور قوت ایسی ہے ہی نہیں جو حسن و قبح کے متعلق کوئی فیصلے صادر کر سکے۔ البتہ عقل آرزوئے حسن کو اپنے فیصلے کرنے میں مدد دیتی ہے۔ احساس حسن عقل کے دائرۂ اختیار میں نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل حسن کی وحدت کو نہیں دیکھ سکتی، فقط اس کے اجزاء کو دیکھ سکتی ہے اور حسن اجزاء میں نہیں ہوتا بلکہ وحدت میں ہوتا ہے۔ عقل حسن کی نئی نئی وحدتوں کے اجزاء کی طرف آرزوئے حسن کی راہنمائی کرتی ہے، جس کی وجہ سے اس کی توجہ ان وحدتوں کی طرف ہو جاتی ہے جس کے اندر یہ اجزاء موجود ہوتے ہیں۔ لہٰذا عقل خودی کی مدد دو طرح سے کرتی ہے، ایک تو یہ کہ اسے بتاتی ہے کہ اسے اپنے موجودہ نصب العین کے لیے جدوجہد کس طرح سے کرنی چاہیے، اور دوسرے یہ کہ اسے نئے نئے بلند تر نصب العینوں یا تصوراتِ حسن کے نظارہ یا مشاہدہ کے لیے اکساتی ہے۔ عقل نہ محبّت کی قلمرو میں داخل ہو سکتی ہے اور نہ حسن کا مشاہدہ کر سکتی ہے۔ یہ امتیاز فقط آرزوئے حسن کو ہی حاصل ہے۔ چونکہ عقل ہمارے ساتھ کچھ راستہ طے کرتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب ہم حسن کی منزل پر پہنچتے ہیں تو بھول جاتے ہیں کہ مدّت ہوئی عقل ہم سے الگ ہو چکی تھی۔

خرد سے راہ رو روشن بصر ہے — خرد کیا ہے؟ چراغِ رہگذر ہے!
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا — چراغِ رہگذر کو کیا خبر ہے!

انسانی اور معاشرتی علوم کی بنیاد محبّت ہے نہ کہ عقل

عقل کا یہ نظریہ نفسیاتِ انسانی کے حقائق کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے اور عقل کے دوسرے تمام نظریات کی نسبت زیادہ معقول اور زیادہ یقین افروز ہے۔ اس نظریہ کی رُو سے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ انسانی اعمال و افعال کے تمام فلسفے دوسرے لفظوں میں ہمارے تمام انسانی اور معاشرتی علوم مثلاً فلسفۂ سیاست، فلسفۂ اخلاق، فلسفۂ تاریخ، فلسفۂ اقتصاد، فلسفۂ تعلیم، فلسفۂ قانون، انفرادی نفسیات، اجتماعی نفسیات وغیرہ عقل سے نہیں بلکہ محبّت سے راہ نمائی حاصل کرتے ہیں۔ عقل صرف محبّت کی راہ نمائی میں ان کو ترتیب دیتی ہے۔ اگر وہ نصب العین جس کی محبّت

ان کو وجود میں لاتی ہے صحیح ہو گا تو ان کو ترتیب دینے والی عقل بھی صحیح ہو گی۔ لہٰذا جس انسانی یا معاشرتی علم کا بنیادی تصوّر خدا نہ ہو وہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام اعمالِ انسانی کا حقیقی سرچشمہ خدا کی محبّت کا جذبہ ہے۔

مقامِ عقل کے متعلّق دَورِ حاضر کی غلط فہمی

افسوس ہے کہ اب تک انسان کے امتیازی اوصاف میں سے اس کے ایک وصف کو جسے ادراک یا عقل کہا جاتا ہے حد سے زیادہ اہمیّت دی گئی ہے اور یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ انسان کا سب سے بڑا وصف جس کی وجہ سے اسے حیوانات پر فضیلت حاصل ہے یہی ہے۔ حالانکہ دراصل انسان کا امتیازی وصف جس کی وجہ سے وہ انسان بنتا ہے اور حیوانات سے برتر ٹھہرتا ہے اس کی آرزُوئے حسن ہے، جو صرف خدا کے تصوّر سے مستقل اور مکمل طور پر مطمئن ہوتی ہے۔ کسی نہ کسی درجہ کی عقل تو اعلیٰ سطح کے حیوانات میں بھی موجود ہے، لیکن تصوّرات کے حسن وکمال کی محبّت کم از کم حیاتیاتی زندگی سے اُوپر کی سطح کے تصوّرات کی محبّت سوائے انسان کے اور کسی حیوان میں موجود نہیں۔ انسان کی عقل کی اگر کوئی اہمیّت ہے تو وہ فقط اس قدر ہے کہ وہ انسان کی آرزُوئے حسن کی خدمت گزار ہے، لہٰذا اس کی اہمیّت ذاتی اور اصلی نہیں، بلکہ آرزُوئے حسن سے ماخوذ اور مستعار ہے۔ اگر انسان کی عقل آرزُوئے حسن کی غلام اور خدمت گزار نہ ہو تو وہ اسے حیوانات سے بھی بدتر بنا دیتی ہے۔ حسن کی تمنا میں ہی انسان کی تمام آرزُوئیں جنم لیتی ہیں اور اپنی جستجو کی راہیں معیّن کرتی ہیں۔ حسن کی تمنّا ہی انسان کے تمام اعمال کی خالق اور راہبر ہے عقل کو یہ مقام حاصل نہیں

حسن خلّاقِ بہارِ آرزوست   جلوہ اش پروردگارِ آرزوست

ہر چہ باشد خوب و زیبا و جمیل   در بیابانِ طلب ما را دلیل

نقشِ او محکم نشیند در دلت   آرزو ہا آفریند در دلت

اقبال دَورِ حاضر کے انسان کو جو اپنی نادانی سے عقل ہی کو انسان کا سب سے بڑا امتیازی وصف سمجھا ہوا ہے، خوب جھنجوڑ کر جذبۂ حسن کی اہمیّت بتاتا ہے۔

ہے ذوقِ تجلّی بھی اسی خاک میں پنہاں   غافل تُو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ　　کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک!

تجلّی کی اہمیّت

ہر انسان کے لیے ضروری ہے کہ خدا کی محبّت کو تفکّر فی الخلق (مشاہدۂ قدرت) تفکّر فی الصّفات (عبادت) اور تخلّق باخلاق اللہ (حسنِ عمل) کے ذرائع سے فروغ دے کر درجۂ کمال پر پہنچائے۔ اس طریق سے اس کے دل کے اندر خدا کی معرفت کا وہ نور پیدا ہوگا جسے اقبالؒ "تجلّی" یا "جلوہ" کا نام دیتا ہے اور چونکہ اس طریق سے اس کا جذبۂ محبّت پوری پوری تشفی حاصل کرلے گا، اور اس جذبہ کے علاوہ تشفی کا تقاضا کرنے والا کوئی اور جذبہ انسان کے اندر رہے ہی نہیں ——— لہٰذا اس کے لیے بے اطمینانی اور پریشانی کی کوئی وجہ باقی نہیں رہے گی۔ اور عقل کے لیے ممکن نہیں رہے گا کہ وہ اس کے دل میں کوئی اعتراضات یا شکوک وشبہات پیدا کرسکے۔ اس کے برعکس اگر انسان کے دل میں خدا کی محبّت اس کی استعداد کے مطابق اپنے کمال کو نہ پہنچے گی تو چونکہ اس کے جذبۂ محبّت کا ایک حصّہ غیر مطمئن رہے گا، اس کا سکونِ قلب مکمل نہ ہوسکے گا۔ اور عقل کے لیے موقع باقی رہے گا کہ اس کو شکوک وشبہات میں مبتلا رہے۔ اگر انسان کا دل خدا کی معرفت کے نور سے پوری طرح منوّر نہ ہو تو اس کی عقل جو فقط اس نور سے ہی راہنمائی پاسکتی ہے بھٹکتی رہتی ہے۔ اور اسے مسرور اور مطمئن ہونے نہیں دیتی۔ حکمت کے بیابانوں میں مدّتوں خاک چھاننے کے بعد اگر عقل کو کہیں پناہ ملتی ہے تو توحید میں۔

در جہانِ کیف و کم گردید عقل　　پے بمنزل بُرد از توحید عقل

اس کے علاوہ چونکہ شریعت کی پابندی اور نیک عملی کی زندگی خدا کی محبّت کا نہ رکنے والا تقاضا ہے، لہٰذا جب خدا کی محبّت اپنے کمال پر ہوگی تو انسان شریعت کی پابندی یا نیک عملی کی زندگی کو کسی مجبوری سے اختیار نہیں کرے گا بلکہ ایک ایسی خواہش سے اختیار کرے گا جسے روکنا اس کے بس کی بات نہ ہوگی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر انسان اپنی عقل کو مطمئن کرنا چاہتا ہے، اگر وہ اس کے اعتراضات کا ایسا جواب مہیا کرنا چاہتا ہے جو اس کے لیے مکمل طور پر کافی اور شافی ہو، اگر وہ

چاہتا ہے کہ دین اور شریعت کے راستوں پر مجبوری سے نہیں بلکہ پورے ذوق و شوق سے گامزن رہے اور نہیں چاہتا کہ مختلف نظریات اور تصوّرات کے درمیان بھٹکتا پھرے تو اسے اپنے دل کو خدا کی محبت اور معرفت کے نور (تجلّی) سے منوّر کرنا چاہیے، ورنہ اس کی روح اس کے فاسد خیالات کی دولتیوں کی مار کھا کھا کر مردہ ہو جائے گی۔ دلوں میں خدا کے نور کا جلوہ فرد اور قوم دونوں کے لیے پیغامِ حیات ہے اور ہماری فطرت کا ایک زبردست تقاضا یہ ہے کہ ہم اس نور کو اپنے دلوں کے اندر بسائیں۔

بے تجلّی مردِ دانا رہ نہ بُرد
از لگد کوب خیال خویش مُرد
بے تجلّی زندگی رنجوری است
عقل مہجوری و دیں مجبوری است

نگہ پیدا کر اے غافل تجلّی عین فطرت ہے — کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا
ہے ذوقِ تجلّی بھی اسی خاک میں پنہاں — غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے

بے تجلّی نیست آدم را ثبات
جلوہ ما فرد و ملّت را حیات

تجلّی سے یہاں اقبال کی مراد خدا کی معرفت یا خدا کی محبّت کا نور ہے۔

تنظیمِ اسلامی کی انقلابی دعوت کا نقیب

ماہنامہ
میثاق
لاہور

زیرادارت: ڈاکٹر اسرار احمد

فی شمارہ -/۵ روپے سالانہ زرتعاون -/۵۰ روپے

خودی اور مشاہدۂ قدرت

خودی کی ایک اہم ضرورت مشاہدۂ قدرت ہے

خودی خدا کی محبت کے جذبہ کی مکمل تشفی چاہتی ہے جو اظہارِ محبت سے ہی ممکن ہوتی ہے۔ لہٰذا خودی اپنے جذبۂ محبت کی کامل تشفی کے لیے اظہارِ محبت کے تمام ممکن ذرائع کو کام میں لاتی ہے۔ ان میں سے ایک ذریعہ مظاہرِ قدرت کے اندر خدا کی صفات کے حسن و جمال کا مشاہدہ اور مطالعہ ہے۔ خدا مخفی ہونے کے باوجود کائنات میں آشکار ہے۔ وہ زندگی ہے، وجود ہے۔ اور وجود کا خاصہ آشکارائی ہے۔ لہٰذا خدا نے اپنی صفات کو اپنی تخلیق میں پوری طرح سے آشکار کر رکھا ہے۔

گفتہ موجود آنکہ مے خواہد نمود آشکارائی تقاضائے وجود

کائنات کی حقیقت سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ خدا کی صفات کے حسن کی جلوہ گاہ ہے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ کائنات گویا ہے ہی نہیں، فقط خدا ہی خدا ہے جس کا حسن کائنات کی صورت میں بے حجاب ہو گیا ہے۔ یا ہم ہیں جو اس حسن کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔

گفت آدم! گفت از اسرارِ اوست
گفت عالم! گفت او خود روبروست
بہ بزم ما تجلی ہاست بنگر
جہاں ناپید و اُو پیداست بنگر
در و دیوار و شہر و کاخ و کو نیست
کہ ایں جا ہیچ کس جز ما و اُو نیست

زمین و آسمان و چار سو نیست
دریں عالم بجز اللہ ہو نیست

کائنات کا یہ مادی پیکر خودیٔ عالم کی ہستی اور قدرت اور قوت کے نشانات میں سے ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز جو ہم دیکھتے ہیں اپنے وجود کے لیے خودیٔ عالم کی صفات کی پُراسرار تخلیقی کارروائی کی مرہونِ منت ہے۔

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است
ہر چہ مے بینی ز اسرارِ خودی است

لہٰذا خودی کو خدا کے حسن کے مشاہدہ سے لذت اندوز ہو کر اپنے جذبۂ محبت کی تشفی کرنے کے لیے کسی دِقّت کا سامنا نہیں ہو سکتا۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم قدرت کے آئینہ پر نگاہ ڈال کر خدا کے حسن کا جلوہ صفت میں دیکھ لیتے ہیں لیکن حسنِ حقیقی کے اس نظارہ کے لیے شرط یہ ہے کہ ہمارا فطری ذوقِ حسن یا خدا کی محبت کا جذبہ مُردہ نہ ہو چکا ہو۔ اور ہماری نگاہ سلامت رہے۔

اندھیری رات میں یہ چشمکیں ستاروں کی
یہ بحر! یہ فلکِ نیلگوں کی پہنائی!
سفر عروسِ قمر کا عماریٔ شب میں
طلوعِ مہر و سکوتِ سپہرِ مینائی!
نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں
کہ بیچتی نہیں فطرت جمال و زیبائی!

صبح و ستارہ و شفق و ماہ و آفتاب
بے پردہ جلوہ ہائے نگاہ مے تواں خرید

فطرت کے مطالعہ سے خدا کی جو معرفت حاصل ہو سکتی ہے وہ کتابوں کے مطالعہ سے نہیں ہو سکتی۔ چمن کا ہر آتشیں رنگ گلِ لالہ انسان کے دِل میں اپنی کشش پیدا کر کے انسانی خودی کی اس مخفی حقیقت کو آشکار کر رہا ہے کہ وہ سراپا آرزوئے حسن ہے۔

کھلا جب چمن میں کتب خانۂ گل
نہ کام آیا ملّا کو علمِ کتابی
کہا لالۂ آتشیں پیرہن نے
کہ اسرارِ جاں کی ہوں میں بے حجابی

قدرت کا حُسن خدا کے حُسن کا آئینہ ہے

قدرت کا حُسن خدا کا آئینہ ہے، جس میں خدا کا جمال منعکس ہوتا ہے اور قدرت کے حُسن کا آئینہ جس میں قدرت کا حسن منعکس ہوتا ہے انسان کا دل ہے۔ لیکن اچھے شاعر کا اچھا کلام انسان کے دل کا آئینہ ہے جس میں انسان کی آرزوئے حُسن کا عکس نظر آتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان جو کچھ سوچتا ہے اور جو کچھ کرتا ہے حُسن کی جستجو کے لیے کرتا ہے۔

حسن آئینۂ حق اور دل آئینۂ حُسن
دلِ انساں کو ترا حسنِ کلام آئینہ

حسنِ خداوندی نے اپنے اردگرد فطرت کا حجاب بُنا ہوا ہے لیکن یہ حجاب اتنا باریک ہے کہ اس میں سے اُن فرشتوں کے تبسم ہائے پنہاں، جو اس حجاب کو بنتے ہوئے اس بات پر ایک رُکی ہوئی ہنسی سے ہنس رہے ہیں کہ یہ حجاب ہے بھی اور نہیں بھی، آشکار نظر آتے ہیں۔ یہ کائنات انسان کو حق تعالیٰ کے دیدار کی دعوت دے رہی ہے اور یہ عجیب بات نہیں، اس لیے کہ ہر حسین جس کا حُسن چھپا ہوا ہو اپنے حُسن کو بے حجاب کرنے کا آرزومند ہوتا ہے۔ خدا کے حُسن کو آشکار ہونا ہی تھا۔

کوئی دیکھے تو ہے باریک فطرت کا حجاب اتنا
نمایاں ہیں فرشتوں کے تبسم ہائے پنہانی
یہ دنیا دعوتِ دیدار ہے فرزندِ آدم کو
کہ ہر مستور کو بخشا گیا ہے ذوقِ عریانی

خودی کی تربیت اور ترقی کا ذریعہ

خودی کے جذبۂ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ خدا کے حسن کا مشاہدہ کرے اور اس مشاہدہ سے اطمینان اور سرور حاصل کرے تاکہ اپنے جذبۂ محبّت کو اور تیز کرے اور حسن کی نامعلوم گہرائیوں اور وسعتوں سے پوری طرح آشنا اور پوری طرح سے لذّت اندوز ہو۔ فطرت کا حسن خودی کی اس کوشش کو آسان بناتا ہے۔ سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، زمین و آسمان، سمندر، جھیلیں، بادل، ندیاں، ہوائیں، سحر کا نور، شام کی شفق، باغ و راغ، رات اور دن کا تغیّر، موسموں کا انقلاب اور حیوانات و نباتات کی زندگی اپنی تمام رنگا رنگی اور ثروت و شوکت کے سمیت مختصراً قدرت کے تمام مظاہر جو قدرت کے مسلسل عمل تخلیق اور تربیت، تعمیر اور ترتیب، تنظیم اور تجویز، تحفظ اور تحسین اور تجمیل اور تزئین کے آئینہ دار ہیں خالق کائنات کے حسن و کمال کا عکس ایسی ہی وضاحت اور صفائی سے پیش کرتے ہیں جیسے کہ کسی باکمال فنکار کا شاہکار اس کے ذہنی، جمالیاتی، اخلاقی اور روحانی کمالات کا عکس پیش کرتا ہے۔ اور خودی جس قدر کارخانۂ قدرت پر خدا کی صفات کے مظہر کے طور پر غور و فکر کرتی ہے، جس قدر مظاہر قدرت کی باریکیوں میں جاتی ہے اور ان کے عوامل اور اسباب کا، ان کی تفصیلات اور جزئیات کا، اور ان کے نتائج اور حاصلات کا جائزہ لیتی ہے اسی قدر زیادہ وہ خدا کی صفات کے حسن سے آشنا ہوتی ہے اور اسی قدر زیادہ اپنی آرزوئے حسن کی تشفی پاکر مسرّت اور اطمینان حاصل کرتی ہے اور اسی قدر خدا کی محبّت کو اس کے درجۂ کمال کے قریب لاتی ہے اور اسی قدر اپنی تربیت اور ترقی کا اہتمام کرتی ہے۔ قدرت گویا انسان کو خدا کی معرفت کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے تختی کا کام دیتی ہے۔

کوہ و صحرا، دشت و دریا، بحر و بر
تختۂ تعلیمِ اربابِ نظر

قرآن حکیم میں مشاہدۂ حسن کی اس شکل کو تفکّر فی الخلق کہا گیا ہے اور مومن کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ خدا کی معرفت حاصل کرنے کے لیے مظاہرِ قدرت پر غور و فکر کرے۔ اقبال شاید قرآن حکیم کے اسی ارشاد کی طرف اشارہ کرتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ مومن قدرت کے مشاہدہ

اور مطالعہ میں غرق رہتا ہے۔

علم ترساں از جلالِ کائنات
عشق غرق اندر جمالِ کائنات

مشاہدۂ قدرت سے اقبال کا شغف

جہاں موقع ملتا ہے اقبال خود مزے لے لے کر مظاہرِ قدرت کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس میں خدا کے حسن کو بے حجاب دیکھتا ہے جو بڑی بے پرواہی کے ساتھ دشت و راغ میں اپنا جلوہ دکھا رہا ہے۔

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن
برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن
حسن بے پروا کو اپنی بے حجابی کے لیے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن؟

مومن کے دل کی آنکھ کائنات کے مشاہدہ سے روشن ہوتی ہے کیونکہ وہ کائنات میں جو فقط خدا کی صفات کی مظہر ہے، خدا کی قدرت کا مشاہدہ کرتا ہے۔

چشمِ او روشن شود از کائنات
تا بہ بیند ذات را اندر صفات

قدرت کا حسن قلب و نظر کی زندگی ہے، کیونکہ وہ حسنِ ازل کی نمود ہے اور اس میں خود حقیقتِ وجود بے پردہ نظر آتی ہے۔

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں — چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں
حسنِ ازل کی ہے نمود، چاک ہے پردۂ وجود
دل کے لیے ہزار سود، ایک نگاہ کا زیاں!

سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب!
کوہِ اُضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں!

ہمیں زندگی کا راستہ اندھوں کی طرح سر نہیں کرنا چاہیے بلکہ اپنے اردگرد کی کائنات کا مشاہدہ اور مطالعہ کر کے اپنی معرفت کے نور کو چمکانا چاہیے اور قرآنِ حکیم کا ارشاد بھی جو ہمیں 'انظر' کہہ کر خطاب کرتا ہے یہی ہے۔

تو کہ مقصودِ خطاب انظری
پس چرا ایں راہ چوں کوراں سری

خدا نے ہمیں آنکھیں اس لیے دی ہیں کہ ہم ان کے نور سے قدرت کا مشاہدہ کریں اور اس مشاہدہ کے ذریعہ سے خالقِ قدرت کی محبت (نگاہ) پیدا کریں۔

بیا با شاہدِ فطرت نظر باز — چرا در گوشۂ خلوت نشینی
ترا حق داد چشمے پاک بینے — کہ از نورش نگاہے آفرینی

کائنات کے حسن کا احساس

کائنات کا حسن ہمارے جذبۂ حسن کا راہنما ہے۔ وہ اسے اکساتا اور تیز کرتا ہے۔ اگر کائنات میں حسن نہ ہوتا تو ہماری خودی کی آرزوئے حسن نہ بیدار ہوتی، نہ اپنے مقصود کو پا سکتی۔

حسن خلّاقِ بہارِ آرزو ست
جلوہ اش پروردگارِ آرزو ست

لیکن اس کے برعکس یہ بھی درست ہے کہ اگر ہمارے دل میں حسن کی آرزو نہ ہوتی تو کائنات کا حسن حسن نہ ہوتا۔ کیونکہ ہمارے پاس کوئی معیار ہی نہ ہوتا جس سے پرکھ کر ہم اسے حسن قرار دے سکتے۔ پھر نہ ہم کائنات کے حسن کی تلاش کر سکتے، نہ اس کے مشاہدہ اور مطالعہ سے اس کے خالق کا کوئی تصور قائم کر سکتے۔ حقیقت کا سارا علم ہمارے اندر ہے ہم سے باہر نہیں۔ قدرت کا مشاہدہ فقط اسے بیدار کرتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ خدا کا عرفان اپنا عرفان ہے اور خدا پر ایمان لانا اپنے آپ پر ایمان لانا ہے۔ اگر قدرت حسن فروش

ہے تو خودی خریدارِ حسن ہے اور ایک کے بغیر دوسرا اپنا مدعا نہیں پا سکتا۔ ایک طرف سے خدا کا حسن کائنات میں پیدا اور ظاہر ہے اور دوسری طرف سے انسان کی آنکھوں میں مخفی اور مستور بھی ہے۔ اگر خدا کا حسن ظہور پائے اور انسان کے دل کی آنکھوں میں مستور نہ ہو یعنی انسان کے دل میں اپنا وہ اثر یا احساس پیدا نہ کر سکے جو وہ انسان کی مخفی آرزوئے حسن کی وجہ سے پیدا کرتا ہے تو اس کا ظہور بھی بے معنی رہے۔ لہٰذا حسن کا اصل مقام انسان کے دل کے اندر ہے اور یہ انسان کا دل ہی ہے جو حسنِ کامل کا صحیح محک و معیار ہے اور خارجی اشیاء میں سے کوئی شے بھی ایسی نہیں جو مکمل طور پر اس کے معیار کے مطابق ہو۔

حسن را از خود بروں جستن خطاست
آنچہ مے بایست پیشِ ما کجاست

اس سے ظاہر ہے کہ تجلّی یا معرفتِ کاملہ کا دار و مدار اسی حسن کے کامل احساس پر ہے جو انسان کے دل کے اندر مخفی ہے۔

وہ اپنے حسن کی مستی سے ہیں مجبورِ پیدائی
مری آنکھوں کی بینائی میں ہیں اسبابِ مستوری!

حکیم و عارف و صوفی تمام مست ظہور
کسے خبر کہ تجلّی ہے عینِ مستوری!

خارجی کائنات کے مشاہدہ کا کام فقط یہ ہے کہ وہ اس احساسِ حسن کو بیدار کرتا ہے جو انسان کے دل کے اندر ہے۔ اور مشاہدۂ کائنات کا یہ کام نہایت ہی اہم ہے کیونکہ انسان کی معرفت کا آغاز اسی سے ہوتا ہے۔

ہر خودی نظروں سے مخفی رہتی ہے

کائنات کے مشاہدہ اور مطالعہ سے خدا کو جاننا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہ مثلاً میں اپنے کسی بہترین دوست کو اس کے بیرونی اعمال و افعال کو دیکھ کر جان لوں۔ بیشک خودیٔ عالم

ہماری جسمانی یا مادی نظروں سے اوجھل ہے لیکن یوں اوجھل ہونے کی وجہ سے وہ ہمارے لیے کسی دوسری خودی کی نسبت جسے ہم جانتے ہوں کم قابلِ فہم نہیں۔ نظروں سے اوجھل ہونا کائناتی خودی کی خصوصیت نہیں۔ ہر خودی ہماری جسمانی آنکھوں سے، جو دراصل مادّی اشیا کو دیکھنے کے لیے بنی ہیں، اوجھل ہوتی ہے اور خودیٔ عالم اس عام قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں۔ انسان کا مادّی جسم اس کی خودی کا ایک مظہر یا آلہ ہے۔ میں اپنے بہترین دوست کے بارے میں جو کچھ جانتا ہوں اس کی وجہ یہ نہیں کہ میں نے اس کی خودی یا شخصیت کو ان آنکھوں سے دیکھا ہے جو ایک ناممکن بات ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس کی شخصیت یا خودی کے بیرونی آثار اور نتائج کو دیکھتا ہوں اور ان کی بنا پر اس حقیقت کا (کوئی معروف معنوں میں منطقی یا علمی یا عقلی یا ریاضیاتی تصور نہیں بلکہ) ایک وجدانی تصور قائم کرتا ہوں، یا براہِ راست اور بلاواسطہ یہ احساس پیدا کر لیتا ہوں کہ وہ میری طرح کی ایک زندہ شخصیت یا خودی ہے، کوئی روبوٹ یا مشین نہیں!

ہر خودی مخفی بھی ہے اور آشکار بھی، واحد بھی ہے اور کثیر بھی

گویا میرا دوست میرے لیے ایک پہلو سے مخفی ہے اور دوسرے پہلو سے آشکار ہے۔ وہ ایک ہے تاہم اس لحاظ سے کثیر ہے کہ بہت سے اعمال و افعال میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ میں اس کو جو ایک ہے اور مخفی ہے اس لیے جانتا ہوں کہ وہ آشکار بھی ہے اور کثیر بھی۔ اس طرح سے خدا ایک ہے اور مخفی ہے لیکن کائنات کے اندر اپنے تخلیقی اعمال و افعال کی وجہ سے کثیر بھی ہے اور آشکار بھی۔ اقبال نے اس سارے مضمون کو صرف دو شعروں میں خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔ خدا ایک ہے اور مخفی ہے، اس کے باوجود وہ کائنات کی کثرت میں آشکار ہے اور خدا کا عاشق کائنات کو دیکھ کر خدا کو پہچانتا ہے۔ یہ کائنات اپنی بے اندازہ وسعت کے باوجود عاشق کے دل میں سما جاتی ہے کیونکہ وہ اس کے محبوب کے حسن کا مرقع ہے۔ اگر تو تخلیقِ عالم کے اسرار کو جاننا چاہتا ہے تو اپنے آپ کو دیکھ۔ تو ایک بھی ہے اور مخفی بھی ہے لیکن اپنے تخلیقی اعمال و افعال کی کثرت سے جانا جاتا ہے۔

ایں پستی و بالائی، ایں گنبدِ مینائی
گنجد بدلِ عاشق با ایں ہمہ پہنائی
اسرارِ ازل جوئی بر خود نظرے واکن
یکتائی و بسیاری، پنہانی و پیدائی

اقبال لکھتا ہے:

"ہم دیکھ چکے ہیں کہ قدرت خالص مادیت کا ایک ڈھیر نہیں جو کسی خلا میں پڑا ہوا ہو۔ یہ واقعات کی ایک تعمیر ہے اور کردار کی ایک منظم صورت ہے۔ اور اس لحاظ سے وجودِ مطلق کے ساتھ ایک عضویاتی تعلق رکھتی ہے۔ قدرت خدا کی شخصیت کے ساتھ وہی تعلق رکھتی ہے جو کیریکٹر انسانی شخصیت کے ساتھ رکھتا ہے۔ قرآن کے خوبصورت الفاظ میں یہ اللہ کی عادت ہے۔ انسانی نقطۂ نظر سے یہ وجودِ مطلق کی تخلیقی فعلیت کی ایک توجیہہ ہے جو ہم اپنے موجودہ حالات میں اس پر عاید کرتے ہیں ... قدرت کا علم خدا کے کردار کا علم ہے۔ جب ہم قدرت کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہم دراصل خودیٔ مطلق سے ایک طرح کی واقفیت پیدا کر رہے ہوتے ہیں اور یہ عبادت ہی کی ایک اور شکل ہے" (صفحہ ۵۶-۵۷ تشکیلِ الٰہیاتِ جدید)

مولانا محمد طاسین کی معرکۃ الآرا تصنیف

مروجہ نظامِ زمینداری اور اسلام

عمدہ سفید کاغذ، دیدہ زیب طباعت، خوبصورت اور مضبوط جلد

قیمت ۳۵ روپے

شائع کردہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، ۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن

ڈاکٹر طاہر سعید کے نام
ڈاکٹر حافظ محمد مقصود (۱۱)

"اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے"

جماعتِ اسلامی

جہاں تک جماعتِ اسلامی کا تعلق ہے وہ اپنے یومِ تاسیس (۱۹۴۱ء) سے لے کر قیامِ پاکستان (۱۹۴۷ء) تک بالکل صحیح خطوط پر آگے چلتی رہی کہ قرآن و سنّت کی ٹھیٹھ اسلامی دعوت سے ایسے انقلابی جان نثار پیدا کیے جائیں جو کسی بھی وقتی یا سیاسی و انتخابی ہنگاموں سے الگ تھلگ رہتے ہوئے پہلے خود تقویٰ، تدبّر، خوفِ خدا اور حبِّ رسولؐ کے ذریعے احسان و تزکیہ کے ایک معتدل مقام پر فائز ہوں۔ اور پھر جب ایک ایسی قوّت مجتمع ہو کر وجود میں آجائے تو وہ بلا کسی تاخیر و توقّف کے نظامِ باطل کے ساتھ براہِ راست ایک فیصلہ کُن ٹکر لے کر اسے قبر کی اتھاہ گہرائیوں میں سلا دینے کا جرأت مندانہ کام سرانجام دے۔

اِس طریقے سے معاشرے کے اندر دعوت الی اللہ کا کام کرنا ایک ایسی معقول اور علّت و معلول (CAUSE AND EFFECT) کی منطق کے مطابق بات تھی جس کی معقولیت سے ایک دانش فروش کے علاوہ اور کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ کیونکہ کسی بھی انقلاب (خواہ وہ اسلامی انقلاب ہو یا مادی انقلاب) کو بپا کرنے کے لیے اس کے انقلابی نظریئے کو عوام میں مقبول بنانا ہوگا اور پھر ان عوام ہی کے اندر سے ایسے باہمت اور باحوصلہ افراد کے دلوں کو جیتنا ہوگا جو اپنی دندان شکن قوتِ کار سے ظالمانہ اور غاصبانہ نظام کے تن بدن میں آگ لگا سکیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا اور کیسی گرم جوش پذیرائی ہوتی اگر جماعتِ اسلامی بالکل انہی خطوط پر نظریۂ توحید کا نعرۂ مستانہ لے کر آگے بڑھتی۔ اور آج اس مملکتِ خداداد پاکستان کے پارلیمنٹ ہاؤس، اسمبلی ہال، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات کے ذریعے شیطان اور طاغوت کے طویل سائے

اور نہ چھٹ جانے والے اندھیارے جس تیزی کے ساتھ جنگل کی آگ کی طرح پھیل کر ہمارے ذہنوں کو پراگندہ اور ہماری فطرتوں کو مسخ کر رہے ہیں شاید اس کی جگہ اسلام کے عادلانہ اور منصفانہ نظام کے اُجالے ہمارے قلوب کی سلامتی اور حفاظت و پاسبانی کے امین ہوتے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۹۴۱ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک جماعت کی انقلابی دعوت نے سینکڑوں بھٹکے ہوئے آہوؤں کو فردوسِ گم گشتہ کی نوید جان فزا، ہزاروں غافلوں کو امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا، اور لاکھوں مایوس و نومید دلوں کو "سردیٔ مرقد سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں" اور "خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں" کے مصداق موت سے قبائے زندگی پا جانے کا پیغام بقا سنایا۔ انسانوں کے ایک جمِ غفیر کو نظریۂ توحید کا پرستار اور ایک انبوہِ کثیر کو اقامتِ دین کی کفن بردوش جدوجہد کے لیے ماہیِ بے آب کی مانند بے قرار اور "فریبِ سود و زیاں" اور "بُتانِ وہم و گماں" کی خیالی اور فانی لذتوں سے بیزار کر دیا۔ اقرارِ ایمان اور دعوائے اسلام کے ضمن میں یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے ساتھ اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً (البقرہ) اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا (التوبہ) اور تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ (الصف) کی شرط لگا کر اور اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا (العنکبوت: ۲) کے ساتھ وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ .... فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِیْنَ ۝ (آیت ۳) اور لَمْ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِیْنَ (التوبہ: ۴۳) کی وعید سنا کر کتنے ہی خوابیدہ ضمیروں میں شورشِ محشر بپا کر دیا اور کتنی ہی خطرپسند طبیعتوں کو فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّنْتَظِرُ (الاحزاب: ۲۳) کی حدتِ انتظار کا خوگر بنا دیا ——

مگر افسوس کہ انقلابی طریقِ کار کی یہ آفاقیت تادیر قائم نہ رہ سکی۔ اور پاکستان بن جانے کے بعد جماعتِ اسلامی نے خود اپنے آپ کو جس بے دردی کے ساتھ باطل اور لادین سیاست کی طوفانی موجوں کے سپرد کر دیا وہ بجائے خود ایک تڑپا دینے والی حقیقت ہے، جبکہ

جماعت کی پوری پالیسی الیکشن کے ذریعے منتخب نمائندوں کے ہاتھوں نفاذِ اسلام اور انتخابی سیاست کی زلف گرہ گیر کی اسیر ہوگئی۔ انہوں نے اس حقیقت کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا کہ انتخابات کے ذریعے اسمبلی ہال اور پارلیمنٹ ہاؤس کے اندر چہرے تو ضرور بدل سکتے ہیں، سطحی اور اوپری اصلاح کا کام تو ضرور ہو سکتا ہے، مگر اس دور کا پورا نظام نہیں بدل سکتا۔ اسے ایک سادہ ترین مثال سے سمجھ لیجیے کہ ایک مکان ہے، جس کے متعلق ایک شخص کی رائے یہ ہے کہ مکان تو بالکل صحیح جگہ پر واقع ہے، مگر دیواروں کے بعض حصّوں سے تھوڑا بہت چُونا گر گیا ہے، چھت کے پلستر میں تھوڑی سی ٹوٹ پھوٹ واقع ہوئی ہے اور فرش میں کچھ ناہمواری پیدا ہوگئی ہے۔ اب یہ شخص بہت بڑی اور سنگین غلطی کا ارتکاب کرے گا اگر وہ اس معمولی ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کی بجائے یک لخت پورا مکان گرا کر اس کی جگہ ایک نیا مکان تعمیر کرے۔ کیونکہ ایسی صورتِ حال میں مکان گرا دینے کی تو قطعاً ضرورت نہیں صرف بگڑے ہوئے نادرست حصّوں کی مرمّت ہی کافی ہوگی۔ اس کے بالکل برعکس ایک دوسرا مکان ہے جو زمین کی پستی پر واقع ہے، جہاں مسلسل بارش کا پانی جمع ہوتا رہتا ہے اور ایک شخص کی رائے یہ ہے کہ مکان بنیادی طور پر ایک بالکل غلط اور ناموزوں مقام پر بن گیا ہے۔ اسے درحقیقت اوپر ڈھلوان پر تعمیر کرنا چاہیئے تھا۔ اب یہ شخص سخت اور فاش غلطی کرے گا اگر وہ اس غلط اور ناموزوں مقام پر بنے ہوئے مکان کی دیواریں بلند کرنے، اس کا پلستر سنوارنے اور چُونا لگانے میں اپنا وقت ضائع کرے۔ دراصل اب کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ اس پورے مکان کو دھڑام سے گرا کر اس کے ملبے کو یہاں سے اُٹھا کر ایک دوسرا اور نیا مکان مطلوبہ ڈھلوان پر تعمیر کیا جائے۔ بالکل اسی طرح ہمارے سامنے اجتماعی زندگی کا ایک نظام باطل ہے۔ اگر اس نظام کے اندر صرف سطحی اور اوپری غلطی اور ناہمواری ہوتی تو ہم انتخابات کے ذریعے نئے چہرے اور نئے ذوق و مزاج رکھنے والے لوگ لا کر اس سطحی (SUPERFICIAL) اور چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو درست کرتے اور نظام کو جڑ بنیاد سے اُکھاڑنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی (جس طرح اوپر والی پہلی مثال میں مکان گرانے کی ضرورت نہیں)، مگر ہمارا تجزیہ (ANALYSIS) یہ ہے اور ہم علیٰ وجہ البصیرت کہتے ہیں (اور اس

بات کی وضاحت گذشتہ صفحات میں آچکی ہے کہ موجودہ نظامِ باطل صرف سطحی یا اوپری طور پر غلط نہیں بلکہ بنیادی طور پر غلط ہے۔ یہ نظام ظالمانہ، فاسقانہ، غاصبانہ اور قاہرانہ ہے۔ نظامِ باطل کے اس مکانِ فاسد میں ظاہری چونا گری اور پلستر چڑھانے سے یہ نظام تبدیل نہیں ہوسکتا، بلکہ شاید اور مستحکم ہو جائے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ باہر سے اس پر تیشہ چلاکر اس کو جڑ بنیاد ہی سے گرا کر منہدم کر دیا جائے۔ اور اس کی بجائے نئی تعمیر عمل میں لائی جائے۔ اس عمل کا نام انقلاب ہے اور یہ کام انتخابی سیاست سے ممکن نہیں۔

موجودہ انتخابی سیاست نے جمہوریت، علم و حکمت اور حریّت و مساوات کا ڈھول تو بڑے طنطنے سے پیٹا ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ یہاں جس طفلِ شریر کا نام جمہوریت ہے، وہ حریّت و مساوات کے لغوی مفہوم تک سے ناواقف ہے۔ یہ طریقہ تو اُس وقت سے رائج ہُوا ہے جب سرمایہ داری، جاگیرداری اور آمریّت (DICTATORSHIP) کے شیطان نے دیکھا کہ اب ظلم و بربریت کے ہاتھوں تنگ آکر عوام الناس اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے اپنے سرمایہ دار آقاؤں کے خیموں کی طنابوں پر جھپٹنے لگے ہیں تو حضرتِ انسان (آدم) کی اس خوفناک خود نگری اور خود شناسی کے پیشِ نظر شیطان نے سرمایہ داری جاگیرداری اور شہنشاہیت کے اس کفر کو اُوپر سے جمہوریت کا ایک خوشنما اور دلفریب لباس پہنا دیا، تاکہ لوگوں کی نگاہیں سرمایہ داروں کے خزانوں اور تجوریوں سے ہٹ کر فریب خوردہ شاہینوں کی طرح کرگسوں کے جھُرمٹ میں رہ کر اس "بُتِ جمہوری" کے ولولہ انگیز قصیدے پڑھتے رہیں۔ اِسی حقیقتِ کبریٰ کا ذکر خود ابلیس کا ایک مشیر ان الفاظ میں کرتا ہے کہ ؎

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہُوا ہے خود شناس و خود نگر
تُو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر (اقبال)

(جاری ہے)

پروفیسر حافظ احمد یار

سورۃ البقرۃ (۱۶)

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیرِ مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغۃ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیرِ مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے یعنی علی الترتیب اللغۃ کے لیے ۱، الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳ اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیرِ بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲ : ۵ : ۱ (۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرۃ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲ : ۵ : ۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲ : ۱۶ يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ
وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾
الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَاۗءَ
بِنَاۗءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَاَخْرَجَ بِهٖ

مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

۲ : ۱۶ : ۱ اللغة

۲ : ۱۶ : ۱ (۱) [يٰٓاَيُّهَا] یہ دراصل تین حروف (کلمات) پر مشتمل ہے یعنی یا + ایّ + ھا سے مرکب ہے۔ ان میں سے "یا" تو حرفِ ندا ہے جو عربی میں کسی کو پکارتے وقت استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ عموماً "اے" سے کیا جاتا ہے ــــ اور "اَیُّ" ایک مبنی بر ضمہ (یعنی ہمیشہ ضمہ (ـُـ) کے ساتھ ختم ہونے والا) لفظ ہے (یہ استفہام والا "اَیٌّ" نہیں جس کے معنی "کون سا" ہوتے ہیں اور جو معرب ہوتا ہے) اس کا کوئی خاص الگ ترجمہ تو نہیں کیا جا سکتا مگر اسے "تو جو....." یا "وہ جو....." کے مفہوم میں لیا جا سکتا ہے ــــ اور آخری "ھا" ضمیر نہیں بلکہ صرف کلمۂ تنبیہ ہے جو مخاطب کو متوجّہ کرنے کے لیے حرفِ ندا کے ساتھ لگتا ہے۔ جیسے ہم پنجابی (اور اردو) میں کسی کو پکارتے وقت اس (منادٰی) کے نام کے آخری حصّے کو ذرا لمبا کر کے بولتے ہیں مثلاً "نعیم" کو پکارتے وقت یا تو "نعی ی ی ی م" کہہ کر یا "نعیمُ و و و..." کی مانند بولتے ہیں۔ عربی میں اس مقصد کے لیے "ھا" منادٰی سے پہلے استعمال کرتے ہیں۔

● اس طرح ان تینوں حرفوں (یا + ای + ھا) کا الگ معنی تو بنتا ہے: اے تو / وہ جو ..... ۔ اور یہ ہمیشہ کسی معرف باللام منادٰی (جسے پکارا جائے) کے شروع میں ایک حرفِ ندا کی مانند لگتے ہیں۔ مثلاً "یاایھا الرجل" کا اصل مفہوم تو بنتا ہے "اے وہ کہ (جو/تو) مرد ہے" مگر محاورے میں اس کا مطلب "اے مرد!" ہی لیا جاتا ہے۔

● اس بات کو یوں سمجھیے کہ حرفِ ندا "یا" کسی معرف باللام منادٰی کے ساتھ استعمال

نہیں ہو سکتا[1] اس لیے کہ ندا کا تقاضا ہے کہ " یَا " کو کھینچ کر بولا جائے اور لام تعریف کا (بوجہ ھمزۃ الوصل) تقاضا یہ ہے کہ اس سے ماقبل کو اس میں ملا دیا جائے۔ اس لیے، " یا " کی لمبی آواز کو بچانے کے لیے، عربی میں اس " یَا " اور منادیٰ کے درمیان ندکر کے لیے " اَیُّھَا " اور مؤنث کے لیے " اَیَّتُھَا " کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ اور لکھنے میں ان سے پہلے صرف ایک " ی " کا اضافہ ہوتا ہے (یعنی " یَا " کو بحذف الف لکھا جاتا ہے جسے پڑھا " یَا " ہی جاتا ہے)۔ یعنی ان دونوں لفظوں کو " یٰاَیُّھَا " اور " یٰاَیَّتُھَا " لکھا جاتا ہے۔ اور کبھی یہ ندا کی " یاء " ساقط کر کے صرف " اَیُّھَا " اور " اَیَّتُھَا " لکھتے (اور بولتے) ہیں۔ اور عملاً یہ صرف ایک حرفِ ندا " یا " کا کام ہی دیتا ہے یعنی " یا " کے ساتھ بھی اور اس کے بغیر بھی یہ "اَے" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح یہاں " یٰاَیُّھَا النَّاسُ " کا ترجمہ " اے تم / وہ جو لوگ ہو " کرنے کی بجائے صرف " اے لوگو " کیا جاتا ہے۔

[النَّاسُ] کے مادہ، وزن وغیرہ کے بارے میں اس سے پہلے البقرہ: ۸ یعنی ۲: ۷: (۳) میں بحث ہو چکی ہے۔

۲: ۱۶: (۲) [اُعْبُدُوْا] کا مادہ "ع ب د" اور وزن "اُفْعُلُوْا" (ھمزۂ وصل ہونے کی وجہ سے ابتدائی " ا " پر کوئی حرکت نہیں دی گئی۔ بلکہ "الناس" کا مضموم " سین " ہی " اُعْبُدوا " کے " عین " سے ملا دیا جاتا ہے)۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد عبد یعبد عبادۃً (نصر) اور اس کے معانی وغیرہ کے بارے میں الفاتحہ: ۵ یعنی ۱: ۴: (۲) میں بات ہو چکی ہے۔ قرآن کریم میں اس مادہ (عبد) سے افعال و اسماء کے مختلف صیغے ۲۷۵ جگہ آئے ہیں اور اس کے یہ

---

[1] البتہ " یَا اَللّٰہُ " کہہ سکتے ہیں (یعنی ھمزۂ وصل کی بجائے ھمزۂ قطع کے ساتھ) اور اس مقصد (یعنی اَللّٰہ عزوجل کو پکارنے) کے لیے شروع میں " یَا " لگانے کی بجائے آخر پر " مَّ " لگانا زیادہ بہتر سمجھا جاتا ہے یعنی " اَللّٰھُمَّ " کی صورت میں اس پر مزید بحث آگے آئے گی۔

مختلف استعمالات اس کے معانی یعنی "عبادت" کا مفہوم اور اس کے تقاضوں کو سمجھنے میں مدد بھی دیتے ہیں ۔

[رَبَّكُمْ] یہ "ربّ" (پروردگار) + كُمْ (تمہارا ، اپنا) سے مرکّب ہے ۔ کلمۂ "ربّ" کے مادہ ۔ وزن اور معانی وغیرہ پر سورۃ الفاتحہ کی ابتداء میں یعنی ۱:۲:۱(۳) میں بات ہو چکی ہے ۔

[الَّذِىْ] اسم موصول (بمعنیٰ "وہ جو کہ" یا "وہ جس نے کہ") ہے

اسماء موصولہ پر بھی ۱:۶:۱(۱) میں بحث گزر چکی ہے ۔

۲:۱۶:۱(۳) [خَلَقَكُمْ] جو "خَلَقَ" (اس نے پیدا کیا) + كُمْ (تم کو) کا مرکب ہے ۔ اس میں لفظ "خلق" کا مادہ "خ ل ق" اور وزن "فَعَلَ" ہے ۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد خلَق ...... يخلُق خَلْقًا (زیادہ تر باب نصر سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی تو ہیں "چمڑے (یا کپڑے وغیرہ) سے کوئی چیز کاٹ کر بنانے سے پہلے اس کے ناپ، ڈیزائن اور صورت وغیرہ کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنا"۔ پھر "مطلقاً کسی چیز کو ایک مقررہ اندازے کے مطابق بنانا" کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس طرح اس میں "(کسی چیز) کو بنانا" یا "......کو پیدا کرنا" کے معنی پیدا ہوتے ہیں ۔ چاہے یہ "بنانا یا پیدا کرنا" کسی سابقہ نمونے کے مطابق اور کسی مقررہ مواد (سامان) سے بنانا ہو (جیسے انسان یا حیوان کی نر اور مادہ سے پیدائش) یا کسی نمونے اور سامان کے بغیر بالکل نئے سرے سے (پہلی دفعہ) بنانا یا پیدا کرنا ہو (جیسے زمین یا آسمان کی پیدائش) اور ان (مؤخر الذکر معنوں میں اس (فعل) کا استعمال صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتا ہے ۔ تاہم اس بناوٹ یا پیدائش میں بھی ایک پیمائش اور ساخت کی موزونیت کا ٹھیک اور درست اندازہ (تقدیر) کے معنی شامل ہوتے ہیں ۔

● عربی زبان میں اس مادہ (خلق) سے فعل باب نصر اور سمع سے (خَلِقَ يخلَقُ) "بوسیدہ ہونا" کے معنوں کے لیے اور باب کرُم سے (خلُق يخلُق)

"عمدہ یا موزوں ہونا" کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مگر قرآن کریم میں "نصر" کے علاوہ کسی دوسرے باب یا اس کے معنوں کے لیے اس کا کوئی فعل استعمال نہیں ہوا۔ البتہ باب "نصر" سے "پیدا کرنا یا بنانا" کے علاوہ ــ ایک آدھ جگہ ــ "گھڑ لینا" کے معنی میں بھی آیا ہے (مثلاً العنکبوت : ۱۷) قرآن کریم میں اس مادہ (خلق) سے فعل ثلاثی مجرد کے افعال و اسماء کے بکثرت صیغے اور باب افتعال اور تفعیل سے ایک دو اسماء مشتقہ سمیت کل ۲۶۱ جگہ مختلف الفاظ وارد ہوئے ہیں۔

[وَالَّذِيْنَ] جو "وَ" (بمعنی "اور") اور "الذین" (بمعنی "وہ سب جو کہ") کا مرکب ہے۔ "وَ" کے معانی پر ۱:۴:۱ (۳) میں اور "الذین" (اور دیگر اسماء موصولہ) پر ۱:۶:۱ (۱) میں بات ہو چکی ہے۔

[مِنْ قَبْلِكُمْ] جو مِنْ (سے) + قبل (پہلے) + کُمْ (تم) کا مرکب ہے۔ "من" کے معنی اور استعمال پر ۲:۲:۱ (۵) میں اور "قبل" کے بارے میں البقرہ : ۴ یعنی ۲:۳:۱ (۴) میں بحث گذر چکی ہے۔ آخری "کُمْ" یہاں جمع مذکر حاضر کی ضمیر متصل مجرور ہے۔ اس کا اردو ترجمہ یہاں "تم" ہی ہوگا۔

۲:۱۶:۱ (۴) [لَعَلَّكُمْ] یہ "لَعَلَّ" (شاید کہ) + کُمْ (تم) کا مرکب ہے۔ اس میں "لَعَلَّ" حروف مشبہ بالفعل میں سے ایک حرف ہے۔ اور یہ اسی طرح آخری "لام" کی فتحہ (ـَـ) پر مبنی ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس کے بنیادی حروف (یا مادہ) "ل ع ل" سے اس "لَعَلَّ" کے سوا اور کوئی فعل یا اسم استعمال نہیں ہوتا۔ تمام حروف مشبہ بالفعل کی طرح "لَعَلَّ" کا اسم ہمیشہ منصوب اور اس کی خبر مرفوع ہوتی ہے۔ معنی کے لحاظ سے اس (لَعَلَّ) میں زیادہ تر توقع اور "ترجّی" (امید رکھنا) کا مفہوم ہوتا ہے تاہم کبھی یہ امکان (ممکن ہونا) اور تعلیل (وجہ بیان کرنا) کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ ان مختلف معانی کو سامنے رکھتے ہوئے اردو میں اس کا بامحاورہ ترجمہ "امید ہے کہ، شاید کہ، عجب نہیں کہ، اور "تاکہ" سے کیا جاتا ہے۔

۲:۱۶:۱ (۵) [تَتَّقُوْنَ] کا مادہ " و ق ی " اور وزن اصلی " تَفْتَعِلُوْنَ " ہے ۔ اس کی اصلی شکل " تَوْتَقِیُوْنَ " تھی ۔ جس میں پہلی واو ساکنہ کو " ت " میں بدل کر مدغم کر دیتے ہیں (یہ قاعدہ مثال واوی سے باب افتعال کے تمام افعال میں اور مہموز کے صرف " اخذ " سے افتعال میں جاری ہوتا ہے یعنی اہل عرب ان افعال کو یوں بولتے ہیں) اس طرح " تَوْتَ " " تَتَّ " ہو جاتا ہے ۔ اور باقی حصّے (قِیُوْن) میں " ق " کی کسرہ ہونے کی بناء پر " ی " کو دے کر خود اس " ی " کو گرا دیا جاتا ہے ۔ یا یوں سمجھئے کہ کسی بھی ناقص فعل کے واو الجمع والے صیغوں میں (جس میں فعل ماضی کا جمع مذکر غائب ، فعل مضارع کے جمع مذکر غائب اور حاضر اور فعل مضارع کا جمع مذکر حاضر شامل ہیں) اصل لام کلمہ (" و " یا " ی ") کو گرا دیا جاتا ہے اور اگر اس سے پہلا حرف ـــ جو عین کلمہ ہوتا ہے ـــ مکسور ہو تو اسے مضموم کر دیا جاتا ہے (فتحہ یا ضمّہ ہو تو اسے اسی طرح رہنے دیتے ہیں) ۔ ناقص واوی ہو یا یائی سب کے واو الجمع والے صیغوں کو عرب لوگ اسی طرح بدل کر بولتے ہیں اور ان کے اسی تلفظ کے طریقے سے گرامر والوں نے مندرجہ بالا قاعدۂ تعلیل نکالا ہے ـــ اسی قاعدہ کے تحت ہمارے زیر مطالعہ لفظ کا آخری حصّہ " قِیُوْنَ " سے " قُوْنَ " ہو جاتا ہے اور مندرجہ بالا دونوں تبدیلیوں (تَوْتَ سے " تَتَّ " اور قِیُوْنَ سے " قُوْنَ ") کے بعد پورا لفظ " تَتَّقُوْنَ " کی شکل میں استعمال ہوتا ہے ۔

● اس مادہ (و ق ی) کے فعل ثلاثی مجرد کے باب ، معنی اور استعمال پر البقرہ : ۲ یعنی ۲:۱:۱ (۷) میں بات ہو چکی ہے ۔ " متقین " کی طرح " تتقون " بھی باب افتعال سے ہے ۔ اور اس مادہ (و ق ی) سے باب افتعال کے فعل " اِتَّقٰی ..... یَتَّقِی اِتِّقَاءً " (دراصل اِوْتَقٰی یَوْتَقِیُ اِوْتِقَاءً) کے بنیادی معنی ہیں " ..... سے بچنا " پھر اردو محاورے میں بعض دفعہ اس کا ترجمہ " ..... سے ڈرنا " بھی کر لیا جاتا ہے ۔ تاہم اصل بنیادی معنوں کو سامنے رکھتے ہوئے اردو مترجمین " اِتِّقَاء " (مصدر) کا ترجمہ اکثر " بچنا ، پرہیزگار بن جانا ، پرہیزگاری پکڑنا ، پرہیزگار ہونا ، پرہیزگاری

ملنا" سے کرتے ہیں ـــــ "بچنا" کے ساتھ ترجمہ کرتے وقت مفعول بہ (جس سے بچنا مقصود ہے) اگر مذکور نہ ہو (جیسے یہاں ہے) تو اس کا تعین عبارت کے سیاق و سباق سے کرلیا جاتا ہے۔ مثلاً یہاں (آیت زیر مطالعہ میں) "دوزخ یا عذاب" سے بچنا مراد لیا جاسکتا ہے۔

[اَلَّذِیْ] کا ترجمہ "وہ جو کہ" / "وہ جس نے کہ" ہوگا نیز دیکھئے : ۱:۶:۱ (۱) ۔

[جَعَلَ] کا مادہ "ج ع ل" اور وزن "فَعَلَ" ہے۔ یعنی یہ ماضی معروف کا پہلا (واحد مذکر غائب) صیغہ ہے۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد (جَعَل.... یجعَل جَعْلاً) کے باب اور معنی و استعمال پر البقرہ : ۱۹ یعنی ۲:۱۴:۱ (۶) پر بات ہوچکی ہے۔

[لَکُمُ] جو لام الجر (لِ) بمعنی "کے لیے" + کُمُ (تمہارا، تمہارے) کا مرکب ہے۔ لام الجر ضمائر کے ساتھ ہمیشہ مفتوح آتا ہے۔ اس کے معانی اور استعمال پر الفاتحہ : ۲ ـــ ۱:۲:۱ (۴) پر بات ہوچکی ہے۔

[اَلْاَرْضَ] کا مادہ "اَرض" اور وزن (لام تعریف کو نکال کر) "فَعْلٌ" ہے۔ اس مادہ سے فعل وغیرہ اور لفظ "ارض" کے معنی وغیرہ کے بارے میں البقرہ: ۱۱ کے ضمن میں ۲:۹:۱ (۴) پر بحث گزر چکی ہے۔ یہاں "الارض" کا ترجمہ "زمین" یعنی کرۂ ارضی سے کیا جاسکتا ہے۔

۲:۱۶:۱ (۶) [فِرَاشًا] کا مادہ "ف ر ش" اور وزن "فِعَالٌ" ہے (جو یہاں بوجہ نصب "فِعَالاً" ہوگیا ہے)۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد فرَش.... یفرُش فِراشًا (باب نصر اور ضرب سے) آتا ہے اور اس کے معنی ہیں "..... کو بچھانا، پھیلانا"۔ لفظ "فَرْش" (جو اردو میں عام مستعمل ہے) اسی فعل کا ایک مصدر ہے جو بمعنیٔ اسم مفعول (مَفْرُوش = بچھایا ہوا) استعمال ہوتا ہے۔ اور زیر مطالعہ لفظ "فِراش" بھی اسی فعل کا مصدر ہے اور "فرش" کے (اردو والے)

معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا اردو ترجمہ "بچھونا یا فرش" ہی کیا جاتا ہے۔

● قرآن کریم میں اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد کا صرف ایک صیغہ آیا ہے (الذاریات: ۴۸)۔ البتہ "فرش، فِراش، فُرُش (جو فرش کی جمع ہے) اور الفَرَاش (جو فراشة کی جمع ہے) کے کلمات چار پانچ جگہ آئے ہیں۔ لفظ "فَرْش" اور "فراش" کے بچھونے کی بجائے کچھ اَور معنی بھی ہوتے ہیں اور ان کا ذکر اپنی جگہ آئے گا۔

(الانعام: ۱۴۲ اور القارعہ: ۴)

۲:۱۶:۱(۷) [وَالسَّمَآءَ] میں "وَ" تو عاطفہ (بمعنی "اور") ہے اور "السماء" کا مادہ "س م و" اور وزن (لام تعریف نکال کر) "فَعَال" ہے۔ اصلی شکل "سَمَاوٌ" تھی مگر الف ممدودہ کے بعد آنے والی "و" (اور "ی" بھی) "ء" کی شکل میں لکھی اور بولی جاتی ہے۔ اس مادہ (سمو) سے فعل ثلاثی مجرد "سَمَا یَسْمُوْ سُمُوًّا" (دراصل سمَوَ یسمُوُ) باب نصر سے آتا ہے اور یہ "بلند ہونا، اونچا ہونا" اور چند دیگر معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جن کا ذکر "بسم اللہ" کی بحث میں سورۃ الفاتحہ کے شروع میں ہو چکا ہے [۱:۱:۱(۱) میں]۔ تاہم قرآن کریم میں اس فعل مجرد کا کوئی صیغہ استعمال نہیں ہوا۔ مزید فیہ (تفعیل) کے کچھ صیغے آئے ہیں جن کا ذکر اپنی جگہ آئے گا۔ انشاء اللہ۔

لفظ "السماء" (یا "سماء") اگرچہ عربی زبان میں متعدد معنی رکھتا ہے (مثلاً آسمان، چھت، گھوڑے کی پیٹھ، بادل، بارش وغیرہ)، تاہم اردو میں اس کا ترجمہ "آسمان" ہی کیا جاتا ہے اور قرآن کریم میں یہ زیادہ تر استعمال بھی ان ہی معنوں میں ہوا ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ (سماء) اور اس کی جمع "سماوات" معرفہ نکرہ مختلف صورتوں میں تین سو سے زیادہ دفعہ آئے ہیں۔ عربی میں لفظ "سماء" بیشتر مؤنث (سماعی) ہی استعمال ہوتا ہے اور اس کی جمع مؤنث سالم آنے کی وجہ یہی ہے۔ اگرچہ اس کی جمع مکسر "اَسْمِیَة، سُمِیٌّ اور سِمِیٌّ" وغیرہ بھی آتی ہے

تاہم قرآن کریم میں یہ (جمع مکسر) کہیں استعمال نہیں ہوئی۔ قرآن کریم میں غالباً صرف ایک جگہ (المزمل : ۱۸) یہ لفظ (سماء) مذکر بھی استعمال ہوا ہے۔ یعنی اس کی تذکیر یا تانیث دونوں جائز ہیں۔

۲:۱۶:۱ (۸) [بِنَاءً] کا مادہ "ب ن ی" اور وزن "فِعَالٌ" ہے۔ (فِراش کی طرح) اس کی اصلی شکل "بِنایٌ" تھی جس میں الف ممدودہ کے بعد والی "ی" عربوں کے تلفظ کے قاعدے کے مطابق "ء" میں بدل گئی ہے۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد "بَنَی ...... یَبْنِیْ بِناءً وَبُنْیانًا" (باب ضرب سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی ہیں : .... (مکان یا دیوار وغیرہ) .... کو تعمیر کرنا یا بنانا"۔ اس فعل مجرد سے مختلف صیغے قرآن کریم میں گیارہ جگہ اور جامد و مشتق اسماء کے صیغے بھی گیارہ ہی جگہ آئے ہیں۔

لفظ "بناء" دراصل تو فعل ثلاثی مجرد کا مصدر ہے مگر یہ بمعنیٰ اسم مفعول استعمال ہوتا ہے (مصدر اسم الفاعل اور اسم المفعول دونوں طرح استعمال ہو سکتا ہے)، یعنی یہ لفظ تعمیر کردہ مکان یا عمارت اور کبھی صرف "چھت" کے معنی میں بھی آتا ہے۔

[وَاَنْزَلَ] میں "وَ" عاطفہ بمعنیٰ "اور" ہے۔ اور "اَنْزَلَ" کا مادہ "ن ز ل" اور وزن "اَفْعَلَ" ہے۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد (نَزَلَ یَنْزِلُ نُزولاً = اترنا) اور اس سے باب اِفعال (جس سے یہ فعل "اَنْزَلَ" ہے)، کے معنی و استعمال وغیرہ کی البقرہ : ۴ یعنی ۲:۳:۱(۲) میں وضاحت کی جا چکی ہے۔ ــــــ یہاں اس (زیر مطالعہ) آیت میں بعض مترجمین نے "اَنْزَلَ" کا ترجمہ "اتارا" کی بجائے "برسایا" سے کیا ہے جو محاورہ اور مفہوم کے لحاظ سے درست ہے اگرچہ اصل لفظ سے قدرے ہٹ کر ہے۔

[مِنَ السَّمَاءِ] یہ "مِنْ" (سے) + "السَّماء" (آسمان) سے مرکب ہے۔ "مِنْ" کے معانی و استعمالات پر ۲:۲:۱(۵) میں اور لفظ "السماء" کے مادہ اور معنی وغیرہ پر ابھی اوپر ــــ ۲:۱۶:۱(۷) میں بات ہو چکی ہے۔

۲:۱۶:۱ (۹) [مَاءً] کا مادہ "م و ہ" اور وزنِ اصلی "فَعَلٌ" ہے اس کی اصلی شکل "مَوَہٌ" تھی جس میں "واو متحرکہ ماقبل مفتوح الف میں بدل گئی اور آخری "ہ" خلافِ قیاس "ء" میں بدل دی گئی ہے۔ اسی لیے "ماءٌ" کی جمع مکسر "مِیاہٌ" اور "امواہٌ" آتی ہے [قرآن کریم میں اس لفظ (ماء) سے جمع کا کوئی صیغہ کہیں استعمال نہیں ہوا]۔

اس مادہ (م و ہ) سے فعل ثلاثی مجرد "ماہَ یمُوہُ مَوھًا" (باب نصر سے اور دراصل "مَوَہَ یمُوہُ") اور "ماہَ یَمَاہُ مَوْھًا" (باب سمع سے اور دراصل "مَوِہَ یمُوہُ") آتا ہے۔ اور اس کے کئی معنی ہوتے ہیں مثلاً "کنویں میں پانی کا زیادہ ہونا" یا "کشتی میں پانی آجانا" وغیرہ۔

● قرآن کریم میں اس مادہ سے فعل مجرد یا مزید فیہ کا کوئی فعل کہیں استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ اس مادہ (م و ہ) سے صرف یہی ایک لفظ "ماء" معرفہ نکرہ مفرد اور مرکب شکل میں کل ۶۳ جگہ وارد ہوا ہے۔ اس لفظ (ماء) کا اردو ترجمہ "پانی"، انگریزی "water" اور فارسی "آب" ہے۔ اور کبھی یہ بمعنیٔ "عرق" بھی استعمال ہوتا ہے۔ زیرِ مطالعہ آیت میں بعض اردو مترجمین نے اس (ماء) کا ترجمہ "مینہ یا بارش" سے کیا ہے جو مفہوم اور محاورہ کے لحاظ سے اور سیاقِ عبارت کی وجہ سے درست ہے۔ اگرچہ اصل لفظ سے ہٹ کر ہے۔

۲:۱۶:۱ (۱۰) [فَاَخْرَجَ بِہٖ] یہ ایک پورا فقرہ ہے جو دراصل چار کلمات پر مشتمل ہے یعنی یہ "فَ" (پس) + "اَخْرَجَ" (اس نے نکالا) + "بِ" (.....کے ساتھ، .....سے) + "ہٖ" (اُس) کا مرکب ہے ان چار کلمات میں سے دو (فَ اور بِ یعنی "فَ" اور "بِ") تو حرف ہیں ایک ("ہٖ") اسم (ضمیر) ہے اور ایک (اَخْرَجَ) فعل ہے۔ ہر ایک کلمہ کے معنی و استعمال کی تفصیل یوں ہے:-

(۱) فا [فَ] بنیادی طور پر تو ایک حرفِ عطف ہے جو دو مفرد یا مرکب اسماء یا دو افعال یا دو جملوں کو ایک دوسرے سے ملانے کا کام دیتا ہے۔ بلحاظ معنی اس

کی خصوصیت "ترتیب" ہے یعنی یہ دو (یا زیادہ) چیزوں یا "فعلوں" میں پہلے، دوسرے تیسرے وغیرہا کا مفہوم رکھتا ہے اس صورت میں اس کا اردو ترجمہ عموماً "پس" پھر اور کبھی "اور" سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ جیسے جاء زیدٌ فبکرٌ۔ یا جاءَ زیدٌ فجلس میں ہے۔

(۲) اس (ف) کی دوسری معنوی خصوصیت "تعقیب" ہے۔ یعنی یہ دوسری چیز یا دوسرے فعل کا ظہور یا وقوع پہلی چیز یا فعل کے (فوراً) بعد ہونے کا مفہوم دیتا ہے۔ سوائے کسی قدرتی وقفہ کے جو پہلے اور دوسرے فعل کے درمیان ہو۔ مثلاً تزوّج فولد لہٗ (اس نے شادی کی پھر اس کا بچہ ہوا)۔ اس صورت میں یہ (فَ) "ثُمَّ" کے معنی میں ہی استعمال ہوتا ہے۔ اس صورت میں اس کا اردو ترجمہ "پھر"، "اس کے بعد"، "پس" سے کیا جاسکتا ہے۔

(۳) اس (ف) کی تیسری معنوی خصوصیت "سببیت" ہے یعنی اس (فَ) کے بعد والی بات اس سے پہلے والی بات کا سبب ہونا ظاہر کرتی ہے۔ کبھی اس کے برعکس "فَ" سے ماقبل والی بات اس کے مابعد والی بات کا سبب ہوتی ہے اور کبھی (بعض خاص شرائط کے ساتھ جن کی تفصیل کتب نحو میں ملتی ہے) "سببیت" کے معنی دینے والی "فَ" (فاء السببیۃ) فعل مضارع کو نصب بھی دیتی ہے (یعنی جب کسی کام کا نتیجہ فعل مضارع کی صورت میں بیان ہو رہا ہو تو)۔ ان (سببیت کی) صورتوں میں اس "فا" (فَ) کا اردو ترجمہ "تو پھر"، "اس لیے"، "چنانچہ"، "مبادا (ایسا نہ ہو کہ)"، "اس بنا پر"، "تاکہ" سے کیا جاسکتا ہے۔

(۴) کبھی یہ (ف) کسی شرط کے جواب میں حرفِ ربط کا کام دیتی ہے۔ اس وقت اس کا اردو ترجمہ "تو"، "تو پھر" یا "تب" سے ہو سکتا ہے۔

(۵) اور کبھی "واو الاستیناف" کی طرح یہ فا (فَ) بھی مستأنفہ ہوتی ہے یعنی اس سے ایک نئے جملے کا آغاز ہوتا ہے۔ اس وقت اس کا ترجمہ "پس"۔ "سچ مچ" کر سکتے ہیں۔

(۶) اور کبھی یہ (فَ) " اِذا فجائیہ " (بمعنی تو اچانک، پس ناگہاں) کے شروع میں لگتی ہے اور " اَمّا " کے جواب میں آنے والے جملے کے شروع میں تو اس (ف) کا لگانا لازمی ہوتا ہے۔

ان مختلف استعمالات کو سامنے رکھتے ہوئے اس " فا " (فَ) کا اردو ترجمہ حسبِ موقع "پس، پھر، تو پھر، اور، تب، یوں، چنانچہ، اس لیے، تاکہ، بعد میں، کم از کم، مبادا، ورنہ تو، سچ مچ" کی صورت میں کیا جاتا ہے۔

[اَخْرَجَ] کا مادہ " خ ر ج " اور وزن " اَفْعَلَ " ہے۔ یعنی یہ اس مادہ (خ ر ج) سے بابِ اِفعال کا فعل ماضی معروف کا پہلا (واحد مذکر غائب کا) صیغہ ہے۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد خَرَجَ یخرُجُ خُرُوْجًا (باب نصر سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی ہیں۔ " نکلنا " ، " باہر نکل آنا " یا " نکل جانا "۔ اور یہ ہمیشہ بطور فعل لازم استعمال ہوتا ہے (یعنی اس سے فعل مجہول نہیں بنتا) بعض صلات (مثلاً فی، علی) کے ساتھ یہ بعض دوسرے معانی (مثلاً ماہر ہونا، بغاوت کرنا وغیرہ) کے لیے بھی آتا ہے مگر ان کے مفہوم میں یہ بنیادی معنی (نکلنا والے) شامل ہوتے ہیں۔

● " اَخرج " اس مادہ سے بابِ افعال کا فعل ہے۔ بابِ افعال سے اس فعل " اَخْرَجَ ..... یُخْرِجُ اِخْرَاجًا " کے مشہور معنی تو ہیں " ..... کو نکالنا، ..... کو نکال دینا، ..... کو نمایاں کرنا " اگرچہ یہ بعض دوسرے معنوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ تاہم وہ (دوسرے) معنی قرآن کریم میں نہیں آئے۔ یہاں (زیرِ مطالعہ آیت میں) بعض مترجمین نے اس فعل (اَخْرَجَ) کا ترجمہ " پیدا کرنا " سے کیا ہے (یعنی پیدا کئے پھل) - یہ صرف مفہوم یا محاورہ کے لحاظ سے ہی درست ہے ورنہ لفظی معنی تو " نکالنا " ہی ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ اکثر نے اس کا ترجمہ یہاں " نکالنا " کے ساتھ ہی کیا ہے۔

[بِهٖ] اس میں آخری ضمیر مجرور (ہ) کا ترجمہ تو یہاں " اس " ہوگا اور " با "

(بِ) کے معنی (یہاں) کے ساتھ، کے سبب سے، کے ذریعے" ہیں۔ اس (بِ یا "با") کے معانی و استعمالات پر اس سے پہلے استعاذہ کی بحث میں بات ہو چکی ہے۔

۲:۱۶:۱ (۱۱) [مِنَ الثَّمَرَاتِ] یہ مِنْ (میں سے) + الثمرات (پھلوں) سے مرکب ہے۔ "مِن" کے معانی و استعمال پر "استعاذہ" کے ضمن میں نیز البقرہ: ۳ یعنی ۲:۲:۱ (۵) میں بات ہو چکی ہے۔ اور "ثَمَرَاتٌ" (جس کی معرف باللام مجرور شکل ہی "الثمراتِ" ہے) کا مادہ "ث م ر" اور وزن "فَعَلَاتٌ" ہے اور یہ لفظ "ثَمَرَةٌ" بروزن "فَعَلَةٌ" کی جمع مؤنث سالم ہے۔

● اس مادہ (ثمر) سے فعل ثلاثی مجرد عموماً "ثَمَرَ یَثْمُرُ ثُمُورًا" (باب نصر سے) آتا ہے۔ اور اس کے معنی "(درخت کا) پھل لانا" اس کے پھل لگنے یا پکنے کا وقت آنا" ہوتے ہیں مثلاً کہیں گے "ثَمَرَ الشَّجَرُ (درخت پر پھل لگا)۔ اور ثَمِرَ یَثْمَرُ (باب سمع سے) "پھلنا پھولنا، زیادہ ہونا (دولت وغیرہ کا)" کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ تاہم قرآن کریم میں اس مادہ سے فعل مجرد کا کسی طرح کا کوئی صیغہ استعمال نہیں ہوا۔ البتہ بابِ اِفعال سے فعل ماضی کے ایک دو صیغے آئے ہیں (الانعام: ۹۹، ۱۴۱) ان پر اپنی جگہ بات ہوگی انشاء اللہ تعالیٰ۔

● کسی بھی درخت یا پودے کے پھل کو عربی میں "ثَمَرٌ" کہتے ہیں۔ یعنی "ثَمَرٌ" بلحاظ جنس ہر اس چیز کو کہیں گے جو کسی درخت کا پھل (کہلاتی) ہے۔ اس میں سے کچھ پھل یا ایک پھل کی بات کرنا ہو تو اسے عربی میں "ثَمَرَةٌ" کہتے ہیں۔ اور اس آخری "ۃ" کو تائے وحدت کہتے ہیں۔ ایک پھل یا کچھ پھل کی جمع بنانا ہو تو انہیں "ثَمَرَاتٌ" (یعنی چند پھل) کہتے ہیں ــــ یہ کسی شے کی پوری جنس میں سے اسی جنس کی کسی ایک چیز کو بذریعہ تائے وحدت ذکر کرنے والا قاعدہ قرآن کریم میں کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً "شَجَرٌ" (جنس درخت ــ ہر وہ شے جو درخت کہلاتی ہے) اور "شَجَرَةٌ"

(کوئی ایک درخت) اسی طرح "بَقَرٌ" (جنس یعنی وہ تمام جانور جو گائے یا بیل کہلاتے ہیں) اور "بَقَرَةٌ" (جنس بقر سے ایک جانور) وغیرہ۔ اس قسم کے بہت سے الفاظ آگے چل کر ہمارے سامنے آئیں گے۔

بعض مترجمین نے "پھلوں" کے عام مفہوم کی بجائے "ثمرات" کا ترجمہ "میوے" کیا ہے جو اردو میں خاص خاص درختوں کے پھل یا پھل کی خاص قسموں کے لیے استعمال ہوتا ہے کیونکہ ہر "میوہ" (کسی درخت یا پودے کا) پھل ہوتا ہے مگر ہر (درخت یا پودے کا) پھل میوہ نہیں کہلاتا۔ لفظ "ثمرٌ" "ثمرة" "ثمرات" اور "الثمرات" (بصورت واحد جمع مفرد مرکب) قرآن کریم میں کل ۲۲ جگہ آئے ہیں۔

[رِزْقًا لَّكُمْ] اس میں "لَكُمْ" تو جارّ (لِ) اور مجرور (کم) بمعنی "تمہارے لیے" ہے۔ لام الجر (لِ) کے معنی و استعمال پر الفاتحہ: ۲ یعنی ۱:۲:۱ (۴) میں بات ہوئی تھی ——

اور "رِزْقًا" کا مادہ "ر ز ق" اور وزن "فِعْلًا" ہے جو لفظ "رِزْقٌ" (بروزن فِعْلٌ) کی منصوب شکل ہے۔ اس مادہ (رزق) سے فعل ثلاثی مجرد "رَزَقَ ..... یَرْزُقُ رَزْقًا" (روزی دینا، عطا کرنا) کے معنی وغیرہ اس سے پہلے البقرہ: ۳ یعنی ۲:۲:۱ (۶) میں بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں "رزقا" اسی فعل مجرد کا مصدر ہے۔ اس کے (عبارت میں) معنی کا تعین "الاعراب" کے ذریعے ہوگا یعنی وہاں بیان ہوگا۔

[فَلَا تَجْعَلُوْا] کے شروع کی "فا" (ف) تو عاطفہ ہے (معنی پس، یا اس لیے) ہے اور "لا تجعلوا" کا مادہ "ج ع ل" اور وزن اس کا "لا تفعلوا" ہے۔ یعنی یہ اس مادہ کے فعل مجرد سے فعل نہی کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد کے مختلف معانی اور استعمالات پر البقرہ: ۱۹ کے تحت ۲:۱۴:۱ (۷) میں بات ہو چکی ہے۔ یہاں یہ فعل بنانا، مقرر کر لینا کے معنی

میں استعمال ہوا ہے۔

[لِلّٰہِ] جو لام الجر (لِ) اور اسم جلالت (اللہ) کا مرکب ہے اس کے معنی وغیرہ الفاتحہ کے شروع میں ۱:۲:۱ (۴) میں بیان ہو چکے ہیں۔

۲:۱۶:۱ (۱۲) [اَنْدَادًا] کا مادہ "ن د د" اور وزن "اَفْعَالاً" ہے۔ جو لفظ "نِدٌّ" (بر وزنِ فِعْلٌ) کی جمع مکسر (کی منصوب شکل) ہے۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد "نَدَّ یَنِدُّ نَدًّا" (باب ضرب سے) "اونٹ کا بھاگ کر جدھر منہ آئے چلے جانا" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے تاہم قرآن کریم میں اس مادہ سے کسی قسم کے فعل (مجرد یا مزید فیہ) کا کوئی صیغہ کہیں استعمال نہیں ہوا۔

کلمۂ "نِدٌّ" (جو زیر مطالعہ لفظ "انداد" کا مفرد ہے) اس مادہ (ندد) سے ایک اسم جامد ہے اور اس کے معنی ہیں "مثل" یا "نظیر"۔ اس لفظ (نِدٌّ) کے ہم معنی لفظ ندید بھی ہے [مگر یہ ـــ ندید ـــ قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا۔ ویسے لفظ "نِدّ" بصیغہ واحد تبھی قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا۔ البتہ اس کی جمع "انداد" قرآن کریم میں چھ جگہ آئی ہے۔

کسی شے کا "نِدّ" (یا ندید) اسے کہتے ہیں جس میں اس شے سے ایک خاص قسم یا خاص نوعیت کی (جوہری یا بنیادی) مماثلت ہو اور جس میں کسی بھی قسم کی مماثلت (اور مشابہت) ہو اسے اس کی "مِثل" کہتے ہیں اس تعریف اور معنی کی رو سے ہر "نِدّ" "مثل" ہے ـــــــــ مگر ہر مثل "نِدّ" نہیں ہے۔ یہ باریک فرق راغب نے "مفردات" میں بیان کیا ہے۔ (دیکھئے مادہ "ندد") اسی فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اردو مترجمین نے "نِدّ" کا ترجمہ "شریک"، "برابر"، "مقابل"، "ہم پلہ"، "ہم سر" یا "برابر والا" سے کیا ہے جو "نِدّ" کے پورے مفہوم کو واضح کرتے ہیں۔ جو محض "مانند" یا "جیسا" یعنی "مثل" کے مفہوم سے بالکل جدا ہے۔

[وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ] اس کی ابتدائی واو (وَ) کے معنوں

کا تعین ابھی آگے بحث " الاعراب " میں ہوگا۔

" اَنْتُمْ " جو جمع مذکر مخاطب کے لیے ضمیر مرفوع منفصل ہے اور جس کا اردو ترجمہ " تم " ہے۔ یہ لفظ دراصل " اَنْتُمُوْ " تھا مگر لکھنے اور بولنے میں اس کی آخری " و " گرا کر " م " کو ساکن کر دیا جاتا ہے۔ البتہ جب یہ ضمیر متصل مرفوع (بشکل " انتم ") یا منصوب (بشکل " کُمْ) بعض خاص کلمات سے پہلے آئے تو اس کی یہ " واو " (میم الجمع کے بعد) لَوٹ آتی ہے اور اسے " تُمُوْ " یا " کُمُوْ " پڑھتے ہیں۔ اس کی مثالیں آگے چل کر ہمارے سامنے آئیں گی۔

[تَعْلَمُوْنَ] کا مادہ " ع ل م " اور وزن " تفعلون " ہے۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد " علِم ..... یعلَم عِلمًا (باب سمع سے) آتا ہے۔ اور اس کے معنی " ..... کو جاننا، جان لینا، سمجھ لینا " ہوتے ہیں۔ یہ فعل ہمیشہ متعدی ہوتا ہے۔ البتہ اس کا مفعول عموماً تو بنفسہ (بغیر صلہ کے) آتا ہے مگر کبھی یہ " باء " (ب) کے صلہ کے ساتھ بھی آتا ہے یعنی " عَلِمَہ اور علم بہ " دونوں طرح کہہ سکتے ہیں۔ قرآن کریم میں یہ فعل زیادہ تر بغیر صلہ کے مگر بعض جگہ صلہ (بِ) کے ساتھ بھی استعمال ہوا ہے ___ اس مادہ (علم) اور اس کے فعل ثلاثی مجرد کے بعض معانی پر الفاتحہ : ۲ [۱:۲:۱ (۴)] اور البقرہ : ۱۳ یعنی ۲:۱۰:۱ (۳) میں بھی بات ہوئی تھی۔

ڈاکٹر اسرار احمد کا نہایت اہم خطاب

جہاد بالقرآن

کتابی صورت میں دستیاب ہے

صفحات: ۵۶ سفید کاغذ، عمدہ طباعت، قیمت فی نسخہ -/۵ روپے

تنظیمِ اسلامی

کا سولھواں ۱۶ سالانہ اجتماع

جمعہ ۲۲ر تا سوموار ۲۵ر فروری ۹۱ء

قرآن اکیڈمی ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

میں منعقد ہوگا۔ اور

امیر تنظیمِ اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کی افتتاحی تقریر

جمعہ ۲۲ر فروری کو ٹھیک گیارہ بجے صبح قرآن اکیڈمی کی جامع مسجد

میں شروع ہوگی اور بعد ازاں روزانہ دو اجلاس ہوں گے:

پہلا صبح ۹ بجے تا ایک بجے دن ● دُوسرا نماز مغرب تا نمازِ عشاء

(نماز عشاء تاخیر سے ادا کی جائے گی۔)

کوئی اجلاس خاص یا خفیہ نہیں!

ع "صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے!"

(خواتین کے لیے پردہ کا اہتمام ہوگا)

FEBRUARY — Regd No. L. No. 8193

MONTHLY
HIKMAT_E_QURAN
LAHORE

VOL. 10
NO. 2

طالبانِ قرآن کے لیے خوش خبری

ان شاء اللہ العزیز ——— اس سال ماہ رمضان المبارک میں

ڈاکٹر اسرار احمد

نماز تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمۂ قرآن

کراچی میں انجمن کی زیر تعمیر قرآن اکیڈمی

واقع خیابانِ راحت، درخشاں، مرحلہ ۶ ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی

میں مکمل کریں گے ——— اور ——— اس کے ساتھ اسی مقام پر

ہفتہ ۱۶ مارچ تا ہفتہ ۱۳ اپریل ۱۹۹۱ء

اقامتی قرآنی تربیت گاہ

بھی منعقد ہوگی۔ جس میں رات کے 'بیان القرآن' پر مذاکرے کے علاوہ دیگر تعلیمی اور تدریسی پروگرام بھی جاری رہیں گے اخراجات طعام -/۵۰۰ روپے ہوں گے۔ چونکہ اقامتی گنجائش بہت محدود ہے، اور ایک محدود تر تعداد میں غیر مستطیع شرکاء کی مفت ضیافت کی کوشش بھی کی جائے گی۔ لہٰذا شرکت کے خواہشمند حضرات زیادہ سے زیادہ یکم مارچ تک اپنی عمر اور تعلیمی استعداد کی تفصیل اور مستطیع یا غیر مستطیع کی صراحت کے

——— ساتھ درج ذیل پتہ پر ارسال کریں ———

زین العابدین جوّاد۔ صدر انجمن خدّام القرآن سندھ

۱۱۔ داؤد منزل، فریئر روڈ، نزد آرام باغ، کراچی (فون: ۲۱۶۵۸۶)